افکار



The

MONTHLY

AFKAR

BHOPAL

PRICE 8 ANNAS

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا (اقبال)

جلد ۵ خیابان شمارہ ۳

آبگینے

آبشار

جائزے

پس نوشت

ماہنامہ
افکار
بھوپال

مئی ۱۹۴۷ء

ادارہ

رشدی ۔ صہباء

بمبئی آفس
۲۶۴ بلاسیس روڈ بمبئی ۸

لاہور آفس
۸ میکلوڈ روڈ ۔ لاہور

دہلی آفس
نواب گنج لائبریری روڈ دہلی

ناگپور آفس
موہن منزل چھاؤنی ۔ ناگپور

زرِ سالانہ للعہ
ششماہی ہیے
فی پرچہ ۸ر

اشاریہ

بھوپال میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے بارے میں بعض حلقوں میں جو غلط فہمیاں اور شبہات پیدا ہو گئے تھے وہ اب دور ہو چکے ہیں اور اصل حالات سامنے آ گئے ہیں۔ پچھلے دنوں قدوس صہبائی، سجاد ظہیر کا ایک خاص پیغام لے کر بھوپال آئے تھے۔ انھوں نے یہاں کی ادبی فضاء کا جائزہ لیکر، بہت جلد رفتار حالات کو سمجھ لیا اور مرکز سے ملحقہ نام نہاد انجمن کو شکست کرکے موجودہ انجمن ترقی پسند مصنفین کو حقیقی جماعت تسلیم کر لیا۔ اور سجاد ظہیر کے نمائندہ کی حیثیت سے اس کا اعلان بھی کر دیا کہ موجودہ انجمن صحیح معنوں میں جمہوری اور آئینی طور پر کام کر رہی ہے اور اس کے اراکین میں سے کوئی بھی رجعت پسند نہیں۔ چنانچہ اب خود وہ بھی اس کے رکن بن گئے ہیں۔ اس طرح وہ قضیہ خوشگوار طریقہ سے ختم ہو گیا، جو ایک عرصہ سے موجب اضطراب بنا ہوا تھا، ہمیں توقع ہے کہ بھوپال کے ترقی پسند ادیب اپنی جدوجہد کو اب اور تیز کر دیں گے۔ اس سلسلہ میں معلوم ہوا ہے کہ انجمن کا دائرۂ رکنیت صوبۂ متوسط تک وسیع کیا جا رہا ہے اور ہندی کے ادیبوں کا ایک گروپ بھی تشکیل پا رہا ہے۔ — بھوپال کو وسط ہند میں ایک قسم کی مرکزیت حاصل ہے اگر انجمن نے قرب و جوار کے علاقوں کے ترقی پسند ادباء سے رابطہ قائم کر لیا تو یہ ہماری تحریک کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا۔

بمبئی میں عرصۂ دراز سے ایک ایسے ادارہ کی کمی محسوس ہو رہی تھی جسے اردو کی علمی، ادبی اور تعلیمی تحریکوں کا مرکز بنایا جا سکے کیونکہ اردو نے بمبئی میں ایک بلند مقام حاصل کر لیا ہے، جس سے اردو کی اہمیت اور افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔ حکومت بمبئی نے مرہٹی، گجراتی، اور کنڑی زبانوں کے ایسے مرکز کے قیام کے لئے بارہ ہزار روپیہ کی رقم دینا منظور کر لیا ہے۔ انجمن اسلام کی کوششیں لائق ستائش ہیں کہ اردو کے لئے بھی دس ہزار روپیہ کی رقم منظور ہو گئی ہے۔ اس سلسلہ میں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں آ چکا ہے، — منجملہ دیگر کاموں کے یہ ادارہ اردو پوسٹ گریجویٹ تعلیم، ریسرچ، اور علمی کام کرنیوالوں کی امداد کا خاص طور سے انتظام کریگا۔ اردو کے ایک مکمل کتبخانہ کا قیام اور ایک علمی رسالہ کا اجراء بھی پیش نظر ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اردو جرنلزم کی طرف بھی اس ادارہ کو خاص توجہ دینا چاہیئے۔ امید ہے کہ آنریری ڈائرکٹر ہماری اس تجویز پر ہمدردانہ غور فرمائیں گے۔

اس اشاعت میں ایک پانچ افسانے اور دو مضمون شامل ہیں — "ترٹنگ" — مسعود بحری نے سماج کی دکھتی ہوئی رگ پر نشتر رکھا ہے، انداز تحریر بہت اچھا ہے۔ "چڑیا کا غلام" — شریف عنایت اللہ ہماری سوسائٹی کا ایک المیہ پیش کر رہے ہیں — "فوری گرام" — اقبال متین نے طنزیہ انداز میں بڑا اچھا پروگرام پیش کیا ہے۔ "تلاطم" — حامد رشید نے ایک لڑکی کی جنسی کشمکش کی ترجمانی کی ہے۔ "دھرتی کے لال" — نشاط مظفر پوری نے غم زدہ مادر ہند کا نقشہ کھینچا ہے — گویا اب خود جا رہا ہے — "اردو رسائل پر ایک نظر" محمود صاحب ایک باذوق ادیب ہیں، آپ نے گہرے مشاہدہ کے بعد یہ مضمون سپرد قلم کیا ہے — "ادب اور سیاست" — اب ادب سیاست سے الگ نہیں رہ سکتا، اختر رومانی نے اس مضمون پر روشنی ڈالی ہے۔

اور آبگینے میں آپ کے تمام محبوب و منفرد شاعر اپنی تازہ ترین تخلیقات کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ ہر نظم و غزل جدید اور ترقی یافتہ رجحانات کی حامل ہے اور کسی تفصیلی اظہار رائے سے بے نیاز —!!

(ادارہ)

مدوجزر

امن کی مشترکہ اپیل!

یہ بہت ہی افسوسناک ہے کہ اس وقت جبکہ ہندستان آزادی کی دہلیز پر قدم رکھ رہا ہے ہندو مسلمان ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں اور بھائی بھائی کو اپنے ہاتھ سے نہایت وحشت و بربریت کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار رہا ہے، پچھلے چند ماہ سے، ہندستان کے مختلف شہروں میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے ہماری گردنیں بار ندامت سے جھک گئی ہیں، جنون کے عالم میں بے گناہوں اور معصوموں کا خون بہایا جا رہا ہے —— ہندستان کی زرخیز زمین آج اپنے فرزندوں کا خون پی رہی ہے، کتنا دلدوز۔ کتنا روح فرسا سانحہ ہے، خون میں لتھڑی ہوئی انسانیت وحشت اور بربریت کے سایہ میں کراہ رہی ہے، لیکن اہل ملک پھر بھی ہوشمندی اور فراست سے کام نہیں لے رہے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ان وحشیانہ طریقوں سے کبھی بھی سیاسی مقاصد کو تقویت نہیں پہنچ سکتی۔

ان ہی حالات سے متاثر ہو کر ہندستان کے نئے وائسرائے لارڈ لوئی ماؤنٹ بیٹن نے ہندستان کے دو سب سے بڑے اور مقتدر سیاسی لیڈروں، قائد اعظم جناح اور مہاتما گاندھی کی طرف سے ملک کے نام حسب ذیل مشترکہ اپیل قیام امن کے لئے شائع کرائی ہے:۔

"ہمیں تازہ غیر قانونی اور متشددانہ افعال سے سخت افسوس ہے جن کی وجہ سے ہندستان کی شہرت کو بٹہ لگ رہا ہے، ظالم و مظلوم خواہ کوئی بھی ہو، لیکن بے گناہ عوام کو شدید ترین مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، ہم ہمیشہ سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے تشدد کے استعمال کی مذمت کرتے ہیں اور ہندستان کے ہر فرقہ سے خواہ وہ کسی مکتب خیال سے تعلق رکھتا ہو اپیل کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف مار دھاڑ اور تشدد کے افعال سے احتراز کرے بلکہ تحریر و تقریر میں بھی اشتعال انگیزی سے اجتناب کرے" اس اپیل کا ہر جگہ خلوص دل سے خیر مقدم کیا گیا ہے اور ملک کے ہر طبقہ میں قدر کی نظروں سے دیکھا جا رہا ہے۔ عوام کو اب اچھی طرح یہ سمجھ لینا چاہئے کہ بے سود خونریزی سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا اور اس قتل و غارتگری کو فی الفور بند کر دینا چاہئے اور اپنے میں خود اعتمادی اور ضبط و تحمل کا جذبہ پیدا کرنا چاہئے، اس اپیل کو صرف جذباتی حیثیت نہیں دینا چاہئے بلکہ ہمارا یہ فرض ہونا چاہئے کہ اس پر عمل پیرا ہو سکیں۔ یہ اپیل خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ کی گئی ہے، عوام کو اس کا ضرور حسب خاطر جواب دینا چاہئے۔ اگر انھوں نے جلدی اپنے ذہن و دماغ کو محبت اور مصالحت کی طرف منتقل نہیں کیا تو ہندستان کو خوفناک تباہی کا سامنا کرنا پڑیگا۔ کیونکہ یہ صاف ظاہر ہے: برطانوی حکومت فساد زدہ" ہندستان کو اختیارات سونپنے کے لئے کسی طرح آمادہ نہیں ہوگی —— اور ہندستان جس آزادی کا خواب دیکھ رہا ہے اس کی تعبیر تخریب کی شکل میں نمودار ہوگی اور ممکن ہے دوسری طاقتیں اس عرصہ میں ہندستان پر اپنا تسلط قائم کرنے کا پروگرام بنالیں ——

اس لئے ہماری نجات اسی میں ہے کہ اپنے باہمی اختلافات، رواداری کے ساتھ دور کرلیں۔ ہندستان کا مستقبل امن و امان ہی سے درخشاں ہو سکتا ہے۔

(ادارہ)

یہ فنکار ــــــ!



وجدی الحسینی

حبک

"ادب اور زندگی توام ہیں۔ دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ان دونوں میں وہی نسبت ہے جو موج و دریا میں ـــ! جب سے انسانی زندگی کے دریا نے سطح عالم پر اپنا دامن پھیلانا شروع کیا ہے اُسی وقت سے ادب کی لہریں بھی ہلکورے لے رہی ہیں ـــ" (ماخوذ از ادبی نفسیات)

دیکھا آپ نے ایک ادیب نے کتنی بڑی صداقت کو کتنے حسین و مختصر اور جامع الفاظ میں ثابت کر دکھایا، ان جملوں کو پڑھنے کے بعد یقیناً آپ اس کے مصنف کی ادیبانہ عظمت کا اندازہ لگانے کے لئے اُس سے واقف ہونا چاہیں گے۔ لہذا سن لیجئے۔ یہ ہے وجدی الحسینی جس نے ان تعمیری خاکوں میں کمال فنی صلاحیتوں سے رنگ بھرا ہے ـــ اور جو اپنے موئے قلم کی حسین اور پُر تنوع جنبشوں سے اس نوع کی سیکڑوں تعمیری خلکے مرتب کرکے ان میں رنگ بھر چکا ہے۔ اس بوٹے سے قد، گٹھے ہوئے بدن، چہرے پر بارعب ڈاڑھی (جسے پہلی نظر میں خاندانی ورثہ سمجھا جائیگا) والے انسان کے متعلق آپ شاید کچھ نہ جانتے ہوں ـــ اور جان بھی کیسے سکتے ہیں جبکہ ایک وجدی ہی کیا سیکڑوں ہزاروں دوسرے مستند ادیب و شاعر بھی شہرت جیسی سستی چیز کو بآسانی حاصل نہیں کر سکے ـــ یہ فخر تو کچھ پنجاب کے ادب نوازوں ہی کو حاصل ہے کہ پلک جھپکتے ہی ذرہ کو آفتاب بنا دیتے ہیں ـــ! ہاں تو وجدی بھی ایک ایسا ہی گوشہ گیر قسم کا انسان ہے جو باوجود اپنی غیر معمولی علمی اور ادبی صلاحیتوں کے اپنے ماحول کی تلخیوں میں گھٹ رہا ہے اور سانس لے رہا ہے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ـــ جناح کیپ ـــ کانگریسی طرز کا کرتا ـــ کیزنسٹوں کی واسکٹ، اور کبھی کبھی واسکٹ پر کھدر کی شیروانی ـــ یہ ہے اُس کی وضع قطع ـــ جو باوجود متضاد پسند کے صرف اس لئے پسندیدہ ہے کہ اس ہیئت کذائی میں اُس کے نصب العین "عالمگیر اخوت" کی جھلک نظر آتی ہے ـــ اُس کا کہنا ہے کہ پُر جوش ایشیا کی تعمیر سے پہلے پُر جوش انسانیت کی تعمیر ضروری ہے ورنہ جنگ زرگری کا آغاز و انجام معلوم! ـــ وہ مختلف حیثیتوں سے ہمارے سامنے ہے ـــ علوم مشرقی کا فاضل، بلند پایہ ادیب، نغزگو شاعر ـــ اور کامیاب نقاد ـــ زندگی کے ہر موڑ پر اُس کی انفرادیت سنگ میل کی طرح قائم ہے ـــ تحریر و تقریر، درس و تدریس اور کتب بینی اُس کے محبوب ترین مشاغل ہیں ـــ دوست احباب کو وہ اپنا بہترین رفیق سمجھتا ہے اور فرصت کے زیادہ لمحے بھی وہ اپنے ان رفیقوں میں گذارتا ہے ـــ! اُسے سگرٹ سے دلچسپی ہے، نہ پان سے، لیکن چائے دن اور رات کے کسی حصہ میں کتنی ہی بار پلائیے، وہ انکار نہیں کریگا ـــ! وجدی۔ زندگی کے بعض لمحوں میں مولانا وجدی بھی بنجاتا ہے ـــ اور جب وہ مولانا بنکر اسلامی پلیٹ فارم سے اسلامی تعلیمات پر تقریر کرتا ہے تو عوام اور خواص دنگ رہجاتے ہیں ـــ اسی طرح جب وہ علم، ادب، معاشرت، تمدن اور اخلاق پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حقائق کا سمندر لہریں لے رہا ہے ـــ لوگ کہتے ہیں ـــ وجدی کتنا بدنصیب ہے ـــ یہ علمیت، یہ قابلیت یہ زور بیان رکھتے ہوئے بھی ایک گھٹے ہوئے ماحول میں اپنی زندگی کے بہترین لمحے ضائع کر رہا ہے ـــ اور جب اسے لوگ باہر جانیکا مشورہ دیتے ہیں تو وہ کہتا ہے علم و ادب کے چراغ ہر گوشۂ سرزمین پر روشن رہ سکتے ہیں پھر باہر جاکر خود کو آزمائش میں مبتلا کرنا کیا ضرور ـــ!! محبت، راست گوئی، خوش گفتاری اور ملنساری اُس کی فطرت ہے۔ زندگی میں شاید ایک بار ہی اُس سے لغزش ہوئی ہے ـــ دوسری بڑی جنگ سے کچھ پہلے رنگون سے پروفیسری چھوڑ کر واپس آنے کے بعد ـــ کسی طرح یہ راز حبک کو معلوم ہوگیا ـــ "رنگون اور دیر بادن" اس راز کی سرخی ہے ـــ لیکن ٹھہریئے، اس سلسلہ میں وہ کسی حد تک بے گناہ اور معصوم بھی ہے جس کی تھوڑی بہت تصدیق اس ذکر حسین کے موقع پر اس کے پُر نور چہرے کی سنجیدگی کے برقرار رہنے سے ہوتی ہے ـــ یوں احباب کا وہ ہم جلیس ہے اور احباب اُس کے ہم جلیس اس لئے اُن کی خاطر سے ہر حسین الزام گوارا ـــ آجکل وہ انجمن ترقی پسند مصنفین بھوپال کا صدر اور جامعہ احمدیہ میں پروفیسر ہے۔ نفسیات اور فلسفہ اُس کے پسندیدہ موضوع ہے جس پر [illegible]

سنگ و خشت

دیرس

لدھیانہ سے ایک "شاطر" ــــ آپ شاعر سمجھ لیجئے ــــ "لطیفی صحافی" (؟) نے ان الفاظ میں ترقی پسند ادیبوں کے خلاف اعلان جنگ کیا ہے :ــ "لطیفی تن تنہا چوکھی لڑائی سے بھی بڑھ کر لڑائی لڑ سکتا ہے ــــ آج یہ قلندر شاعر نام نہاد ترقی پسند شعر و ادب کے گونا گوں اور بوقلموں گاؤ تکیوں، گرہ بالشوں، خرگوشوں، چھپکلیوں، تھن دار جانوروں، سیمنٹ فیلوں، دریائی گھوڑوں، نٹ کھٹ بونوں، جل پریوں، زنبوروں، تیتریوں، پشودا زیرداروں، گیدڑوں، کرگسوں، گینڈوں، کنگروؤں، مٹی کے مادھوؤں، بھانڈوں بھڑوے پروفیسروں، قصیدہ خوانوں اور سازندوں کے خلاف معرکہ آرائی کا واشگاف اعلان کرتا ہے اور ڈنکے کی چوٹ اعلان کرتا ہے کہ وہ ان سب کی شہرتوں کے نقاب تین برس کے اندر تار تار کر ڈالیگا" ــــ ہمیں توقع ہے کہ ہوشمند لوگ ان بزرگوار کو جلد از جلد آگرہ پہنچانے کی سعی بلیغ فرمائیں گے، وہاں پھر چوکھی لڑائی کے لئے اچھا محاذ مل جائیگا ۞

فراق کی عشقیہ شاعری سے تو آپ بارہا محظوظ ہوئے ہونگے، لیکن آج ہم ان کے عشقیہ خطوط کی ایک جھلک پیش کر رہے ہیں جو انھوں نے دلی کی ایک لڑکی شیلا کماری کو اپنانے کے لئے لکھے ہیں :ــ "زندگی میں مجھے سب کچھ ملا، جیون ساتھی کوئی نہیں ملا ــــ اگر جیون ساتھی بن کر کوئی میری صلاحیتوں سے فیضیاب ہونا چاہے تو اسے آسمان ادب کا سب سے زیادہ درخشندہ ستارہ بنا سکتا ہوں ــــ ارے یہ میں کیا کہہ گیا ــــ ایسا ممکن بھی ہے؟" ــــ ایک دوسرے خط میں لکھا ہے :ــ "تمہارے گھر کے سوا کسی اور جگہ ملاقات کرنے کیلئے تیار ہوں ــــ اپنے ساتھ اپنی شائع شدہ کتابیں لیتا آؤں گا اور اپنے ہاتھ سے تمہیں دونگا ــــ اس کے بدلے میں مجھے کیا ملیگا؟" اس "شاعرانہ طلب" کی داد نہیں دی جا سکتی، کیا نیاز فتحپوری ــــ فراق کے لئے کوئی "شاعرگر" جیون ساتھی تلاش کرنے کی کوشش کریں گے! ۞

گیسو دراز خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں :ــ "میں حیدرآباد میں راجاؤں اور نوابوں کے ہاں ٹھہرا کرتا تھا اور اس کے بعد اپنے بچوں کے پاس ٹھہرنے لگا جو حیدرآباد میں رہتے ہیں مگر اب اچھوتوں اور غریبوں کے گھروں میں ٹھہرونگا" ــــ معلوم نہیں بھنگی کالونی حیدرآباد میں ہے یا نہیں ورنہ گاندھی جی کی ریہرسل مکمل ہو جاتی ۞

حکومت یوپی نے افسانہ نگار رام شکیل کو ہندو مسلم اتحاد کے موضوع پر ایک جلسہ میں تقریر کرنے پر گرفتار کر لیا ہے۔ وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ جلسہ کے لئے اجازت نہیں لی گئی تھی ــــ ہندو مسلم اتحاد کے لئے جلسہ کی اجازت اپنی نظیر آپ ہے!۔

نام پی کے ایک نوزائیدہ ہفتہ وار نے مشہور ادیب ابراہیم جلیس کو اپنے ادارہ میں شامل کیا تھا، مگر نائب صاحب نے پہلے ہی پرچہ سے ترقی پسندوں کے خلاف محاذ بنانا شروع کر دیا ہے اور اب ابراہیم جلیس نے علیحدگی اختیار کر لی ہے! ــــ سرمایہ دار پرچے ادیبوں کے ضمیر کو خریدنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے ۞

مسٹر چرچل نے اعلان کیا ہے کہ برطانوی سلطنت کو تباہی کے عمیق غار کی طرف ڈھکیلا جا رہا ہے اور سلطنت کے پرخچے اڑنے والے ہیں ــــ مگر افسوس ہے کہ مسٹر چرچل کی آواز صرف ان ہی تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ زمانہ جنگ نہیں بلکہ امن کا دور دورہ ہے۔

آبگینے

حقیقی شعر کائنات کی حسین ترین تفسیر ہے!

دُعا

—— شاعرِ انقلاب قاضی نذر الاسلام ——

شام کے گھُپ اندھیرے میں
رجنی پھوُل سجاؤ!
بے آس دلوں کے مندر میں
پریم کا راگ بہاؤ!
اَن داتا رجنی پھوُل سجاؤ!

آنسو جل کی لہروں میں
شبھ کنول لہراؤ!
جس سے دُکھ، سُکھ بن جائے
وہ گیت کوی بن جاؤ!
ان داتا شبھ کنول لہراؤ!

آئے دُکھ تو اُس کی خاطر
دُکھ میں سُکھ بن جاؤ!
آدھی رات کے دیپک کو
پریم کا راگ سناؤ!
ان داتا دُکھ میں سُکھ بن جاؤ!

مترجمہ — محمد یونس احمر

جمہوری سیلاب

قدم قدم پہ کھلے ہیں بغاوتوں کے عَلم
بچھی ہوئی ہے ہر اک قصر میں صفِ ماتم
دھماکے گونج رہے ہیں فضاؤں میں پیہم
غمِ حیات پہ طاری ہے اس کا عالم
غمِ حیات کی بنیاد ڈھا رہے ہیں ہم
مثالِ سیلِ رواں بڑھتے جا رہے ہیں ہم

مصیبتوں نے بھی دیکھا قریب آ کے ہمیں
پرکھ لیا ہے مظالم نے بھی ستا کے ہمیں
فریب دیکھے کبھی اور کبھی ڈرا کے ہمیں
ستم نے دیکھ لیا خوب آزما کے ہمیں
ستم شعار کو آج آزما رہے ہیں ہم
مثالِ سیلِ رواں بڑھتے جا رہے ہیں ہم

دلوں میں جوش نگاہوں میں ہے غضب کا جلال
ہزار آندھیاں ہمراہ سیکڑوں بھونچال
ہیں سب کے سب متبسم کوئی نہیں ہے نڈھال
ٹپک رہا ہے جبینوں سے دورِ نو کا جمال
نئی حیات کا پیغام لا رہے ہیں ہم
مثالِ سیلِ رواں بڑھتے جا رہے ہیں ہم

نیاز حیدر

عروسِ صبح

وہ بے خمار سہی لیکن یہ بے خمار نہیں
شرابِ ناب حریفِ نگاہِ یار نہیں
گناہ قصد ہے، دونوں گناہگار نہیں
تجھے نظر پہ مجھے دل پہ اختیار نہیں
ثبوتِ مہر و وفا چاہیئے نیا اے دوست
نگاہِ لطف و تبسم کا اعتبار نہیں
یہ نو بہارِ نزاکت ناب ہے لیکن
ترا وشِ دُرِ شبنم تو گُل پہ بار نہیں
فضائے راز میں کتنی بخیل ہے فطرت
حقیقت ایک بھی ذرّے کی آشکار نہیں
نگاہ منتظرِ آفتابِ تازہ ہے
عروسِ صبح ستاروں کو سوگوار نہیں
سرورِ علم و ہنر لاکھ خوشگوار سہی
سرورِ عشق سے اے وجدؔ خوشگوار نہیں

سکندر علی وجدؔ

کوشش

تیرہ و تار خلاؤں میں اُجالے کی تلاش
ایک ناکام سی کوشش کے سوا کچھ بھی نہیں
آسماں نور کی قندیل لئے پھرتا ہے،
میرے ویرانے پہ جھکتی نہیں کرنوں کی جبیں

کتنے بیتے ہوئے لمحات کی بھولی یادیں
آج بھی پردۂ افکار پہ ہیں عکس فشاں
کتنی بھٹکی ہوئی راہوں میں مرے نقش قدم
میری نیرنگیٔ تقدیر پہ ہیں خندہ زناں

کتنی مایوس امیدوں کے سسکتے دیپک
میری پلکوں پہ شب و روز جلا کرتے ہیں
کتنی ناکام تمناؤں کے غمگیں طوفاں
میرے سینہ کی فضاؤں میں اُٹھا کرتے ہیں

کاش بجھ جائیں امیدوں کے یہ جلتے دیپک
کاش تھم جائیں تمناؤں کے بڑھتے طوفاں
زندگی پا نہ سکے گی ابھی منزل کا سراغ
آج ہے وقت کے ہاتھوں میں تشدد کی عناں

آؤ اس دور کے پرچم کو جھکا دیں بڑھ کر
خونِ امروز سے پیمانۂ فردا بھر دیں
ورنہ بے نور خلاؤں میں اُجالے کے لئے
ایک ناکام سی، بے کار سی کوشش نہ کریں

اشعر ملیح آبادی

دل پارے

نہ دیکھ ذوقِ طلب پائمال ہے کہ نہیں
حجاب خود ہی شکستِ جمال ہے کہ نہیں

کسی طرح مری جانب نہ اُٹھ سکی جو نگاہ
وہی نگاہ مری عرضِ حال ہے کہ نہیں

سوال جُرم ہے لیکن مری نگاہ سے دیکھ
ترا سکوت بہ رنگِ سوال ہے کہ نہیں

زمانہ جا تو رہا ہے ترے خیال سے دُور
میں سوچتا ہوں یہ تیرا خیال ہے کہ نہیں

مٹا دیا مجھے اُس نے تو غم نہ کر ہمدم
یہ اور بات مجھے بھی ملال ہے کہ نہیں

میں کہہ رہا تھا نہ لے دردِ عشق اے مجروحؔ
سکوں سے اور طبیعت نڈھال ہے کہ نہیں

مجروح سلطانپوری

دو گلوں کی نرم شاخیں دفعتاً ٹکرا گئیں
تیرے ملنے کی مجھے دشواریاں یاد آ گئیں

کامیابی کے لئے میں نے اُٹھایا تھا قدم
اتفاقاً اُن کے ہونٹوں پر دعائیں آ گئیں

میں یہ سمجھا تھا کہ مجھ پر بھی کرم فرمائیں گی
وہ بہاریں جو خزاں والوں کو دل بہلا گئیں

وہ نگاہیں جن کو تھا اپنی شکیبائی پہ ناز
ایک ایسا بھی مقام آیا کہ دھوکا کھا گئیں

گاہ وہ مچلے ہوئے جاسے بڑے بیباک تھے
گاہ وہ نظریں بڑی معصوم تھیں شرما گئیں

اوّل اوّل انجمن میں حُسن کے چرچے نہ تھے
آخر آخر موجؔ کی رسوائیاں کام آ گئیں

موجؔ (علیگ)

اُمید

یوں بھی مری اُمید نے کاٹی ہے زندگی

اکا جل ہو جیسے نرگسی آنکھوں میں خندہ زن		رقصاں ہو جیسے عارضِ تاباں پہ چاندنی
جیسے کسی کے صندلی ہاتھوں میں سُرخ پھول		جیسے کسی کی چاند سی گردن میں ہنسلی
جیسے حسین ساغرِ رنگیں میں عکسِ مے		جیسے کنول ہو جھیل کی خوابیدہ لہر میں
جیسے کوئی شریر گوالن بوقتِ شام		پیتل کی گاگریں لئے پھرتی ہو شہر میں

اور یوں بھی سرد ہچکیاں بھرتی رہی امید

حسرت ہو جیسے ڈوبتی آنکھوں میں وقتِ مرگ		مرنے کے بعد جیسے ہو انساں کا رنگ زرد
جیسے کسی کسان کے چہرے پہ خاک دھول		جیسے گلی کے موڑ پہ کوڑھی کی آہِ سرد
جیسے اُداس گاؤں کے بجھتے ہوئے دیئے		جیسے کسی تھکی ہوئی "دیوی" کا رقصِ خام
جیسے جوان بیوہ کے سینے پہ بوجھ سا		جیسے کسی کے دہریہ لب پہ خدا کا نام

میں سوچتا تھا مر چکی ہے اب مری اُمید

لیکن یہ انقلاب کا آوازۂ بلند		اور سرخئ حیات کی خوش رنگ چاندنی
ہر موڑ کی تباہیاں باہوں میں بھینچ کر		جانے مری اُمید سے کیا بات کہہ گئی
میں تھامتا ہی رہ گیا اوہام کا علم		یہ کیا جنوں ہے کونسا جذبہ ہے کچھ کہو!
آتی ہے یوں حیات کے احساس کی صدا		جیسے مری اُمید کا کوئی خدا نہ ہو

کیا پھر مری اُمید نے پائی ہے زندگی؟

ظہور نظر

سِلکِ شکستہ

محبت، ہمدم و دمساز بھی ہے
مرے احساس کی پرواز بھی ہے
مگر اے دردِ دل اتنا بتا دے
محبت سوز ہے، یا ساز بھی ہے!

خواب تھی انکی جدائی کہ حقیقت لیکن
زخم باقی ہے ابھی، درد جہاں اُٹھتا ہے
اتنی مدت گئے اب تو تو بھلا کیا دیتا،
ہاں! مگر چاندنی راتوں میں دھواں اُٹھتا ہے

(جیل کی تاریک رات میں)

کالی کالی گھٹاؤ ساون کی
اے نسیمِ بہار کے جھونکو!
مستی و بیخودی کے عالم میں
یہ نمک پاشیاں۔ ذرا۔ روکو
دل کی چوٹیں اُبھر نہ آئیں کہیں
نقشِ ماضی نکھر نہ جائیں کہیں

درمقفل، خموش ہے زندال
کوئی رہ رہ کے گڈ گڈا تا ہے
آہ اِن غم نصیب راتوں میں
کون آتا ہے؟ کون جاتا ہے!!
اُف دل آزاریاں تصور کی
سادہ پرکاریاں تصور کی

ظ۔ انصاری

دو نغمے

رباعی

یہ غم یہ مفلسی کا جینا کیوں ہے
اے جامِ شراب سے بہلنے والو!
گرداب میں مفلس کا سفینہ کیوں ہے
مزدور کے ماتھے پہ پسینہ کیوں ہے

موت اور آزادی

موت کا ڈر ہو تو ملتی ہے کہاں آزادی
موت کے سائے میں ہوتی ہی جواں آزادی
کون کہتا ہے کہ ڈرتے ہیں شہیدانِ وطن
موت کی حد سے گذرتے ہیں شہیدانِ وطن
دیکھ کس شان سے مرتے ہیں شہیدانِ وطن
موت آتی ہے تو کہتی ہے زباں ۔ آزادی

قمر جلال آبادی

غلامی

اُف یہ تہذیب کے شعلوں میں جھلستی دنیا
چلیے اس تیرہ جہنم کا خدا کوئی نہیں
برتر اقوام کو فردوسِ مسرت کی تلاش
اور دردِ دلِ انساں کی دوا کوئی نہیں

یہ کڑی دھوپ میں ہل جوتتے مجبور کساں
جسم سوکھے ہوئے مرجھائے ہوئے دل کے کنول
اور سرمایہ کی راتوں پہ یہ پھیلا پھیلا
بوڑھے دہقاں کی جواں بیٹی کا میلا آنچل

یہ ہر اک گام پہ ہر موڑ پہ پھیلے ہوئے ہاتھ
اونچے ایوانوں کی دہلیز پہ کنگلوں کی قطار
سوکھے ہونٹوں پہ دعاؤں کے سنہرے الفاظ
اور کاسہ میں فقط گالیاں، جھڑکی، دھتکار

کارخانوں میں مشینوں کی یہ شوریدہ سری
مِل کے فرعون کی آنکھوں میں رعونت کے شرار
اور مزدور کی جلتی ہوئی پیشانی پر
عارضہ اور تپِ دق کی شعاعوں کا نکھار

یہ فلک بوس عمارات یہ ان کے مالک
گرم کمروں میں جوانی کے شراروں کی تلاش
اور دیوار کے سائے میں بدررو کے قریب
ایک معمار کی سردی میں ٹھٹھرتی ہوئی لاش

یہ بھی انسان ہیں مظلوم ہیں دکھیارے ہیں
یہ سمجھتے ہیں کہ تقدیر بدل سکتی نہیں
ان کی شریانوں میں وفا کے دھارے ہیں رواں
سرد شعلوں سے یہ زنجیر پگھل سکتی نہیں

ہمنشیں ظلم کے بادل نہیں چھٹنے والے
کھول کر اونچا بغاوت کا پھریرا کر دیں
کس کو معلوم ہے کب مہرِ درخشاں نکلے
وقت سے پہلے ہی عالم میں سویرا کر دیں

نشاط شاہدوی

شعلہ و شبنم

کیفِ صد رنگ کا جواب کہاں　　چشمِ ساقی کہاں شراب کہاں

لطف ہی لطف دیکھنے والے　　واقفِ لذتِ عتاب کہاں

دل نہ جبتک ہو سوزِ غم سے گداز　　روح میں گرمیٔ شباب کہاں

غم خود اک اضطراب ہے لیکن　　غم سے تسکینِ اضطراب کہاں

دن بھی دیکھا ہے اُنکے ساتھ مگر　　چاندنی رات کا جواب کہاں

دل سے نظروں کو پھیرنے والے　　کروٹیں لیگا انقلاب کہاں؟

دستِ ساقی میں جام ارے توبہ　　آج ٹھہریگا آفتاب کہاں

تیرے قدموں کی خاک ہو جائے　　زندگی اتنی کامیاب کہاں

خود نظر بن گئی حجابِ جمال　　اب انھیں دیکھنے کی تاب کہاں

ہے بیک وقت شعلہ و شبنم　　اے محبت ترا جواب کہاں

اُٹھ کے ملنے کو تھی نظرِ اقبال
اُن کو آنے لگا حجاب کہاں

اقبال خلیلی صفی پوری

اعتذار

اے مری دوست! مری پیکرِ صد رعنائی
چھین لے مجھ سے مرا ذوقِ جبیں فرسائی

بربطِ شوق کے ٹوٹے ہوئے تاروں سے نہ کھیل
سرد پڑتے ہوئے ان دل کے شراروں سے نہ کھیل
میرے اجڑے ہوئے گلشن کی بہاروں سے نہ کھیل

کیوں مری سمت نسیمِ چمنِ ناز آ گئی!

میں نے مانا کہ گراں ضبطِ الم ہے تجھ کو
اپنی ہی مست نگاہی کی قسم ہے تجھ کو

محفلِ ناز سے اب دور ہی رہنے دے مجھے
صدمۂ یورشِ آلام ہی سہنے دے مجھے
اب امنڈتے ہوئے طوفاں میں ہی بہنے دے مجھے

مجھ کو احساس ہے کس بات کا غم ہے تجھ کو!

شوقِ خوابیدہ کو ممنونِ کرم کر نہ ابھی!
کتنی معصوم ہے! نادان ہے! غم کر نہ ابھی!

مجھ سے خاموشیِ پیہم کی شکایت ہے فضول
ایک مجبور سے امیدِ بغاوت ہے فضول
سخت ہے! قیدوایاتِ محبت ہے فضول

دیکھ تو میرے لئے چشم کو نم کر نہ ابھی!

مسکراتی ہوئی آنکھوں کا اشارا پا کر!
تیری ہنستی ہوئی نظروں کا سہارا پا کر!

اب مجھے گردشِ دوراں پہ بھی چھانا ہو گا
شور و ہنگامۂ طوفاں پہ بھی چھانا ہو گا
وسعتِ عالمِ امکاں پہ بھی چھانا ہو گا!!

بخت چمکیگا مرے عزم کا تارا پا کر!!

اے مری دوست! مری پیکرِ صد رعنائی
چھین لے مجھ سے مرا ذوقِ جبیں فرسائی

مجیب خیرآبادی

اعتبارِ محکم

خیال و فکر نہ اپنے نہ اپنا عالم ہے
جو تم نہیں تو نظامِ شعور برہم ہے

نہ ہے مجھے غمِ ہستی نہ فکرِ عالم ہے
نفس نفس میں تری یاد ہے ترا غم ہے

خوشی نہ کوئی خوشی ہے نہ غم کوئی غم ہے
باہتمامِ حیات اپنا اپنا عالم ہے

یہی نہیں کہ تجلی ہی شمعِ عالم ہے
نظر کا حسن بھی اپنی جگہ مسلّم ہے

یہ جھلملاتے ہوئے اشک تیری آنکھوں میں
سحر قریب ہے غنچوں پہ رقصِ شبنم ہے

مرے مذاقِ محبت کی خیر ہو یارب
خرد بھی ہوش میں ہے اور جنوں بھی محکم ہے

نقاب اُٹھا کے ذرا اس طرف بھی ایک نظر
بہت دنوں سے نگاہوں میں روشنی کم ہے

غمِ حبیب سلامت تو زندگی کی قسم
ہر ایک سانس مری اعتبارِ محکم ہے

خوشا مذاقِ تصور کی وسعتیں اے دوست
کہ اب نظر ہی مری جلوۂ مجسّم ہے

طرب حیات کی شادابیاں خدا رکھے
ہر ایک سانس میں پنہاں امانتِ غم ہے

آصف طرب

کرنیں

گر نہیں تیرے لئے لطفِ بہاراں نہ سہی
عیش و عشرت نہ سہی، بزمِ شبستاں نہ سہی
ہو مبارک یہ جوانمردوں کا جینا تجھ کو!
ہمتِ مور تو ہے مُلکِ سلیماں نہ سہی

لطفِ ساحل نہ سہی، تلخیٔ طوفاں ہی سہی
نورِ ایماں نہ سہی، ظلمتِ عصیاں ہی سہی
ہائے محرومیٔ جاوید کہ یہ بھی تو نہیں!
زندگی خواب سہی، خوابِ پریشاں ہی سہی

کسی دل کے لئے پھر باعثِ راحت نہیں رہتی
ہوس کی لوٹ بن کر قابلِ الفت نہیں رہتی
کوئی حوّا کی بیٹی بیچنے لگتی ہے جب عصمت
تو وہ عورت تو ہوتی ہے مگر عورت نہیں رہتی

رات کے ڈوبتے تاروں نے یہ بتلایا ہے مجھے
رات کتنی ہی بڑی رات ہو ڈھل جاتی ہے
گر کوئی چاہے تو زنجیرِ درازِ ظلمت!
نورِ خورشید کی شمشیر میں ڈھل جاتی ہے۔

سلیمان اریب

آبشار

ترنگ

چڑیا کا غلام

فوری گرام

تلاطم

دھرتی کے لال

ہر حقیقت ایک خاموش افسانہ ہے اور ہر افسانہ ایک بے جی حقیقت!

مسعود بحری

ٹرنگ

"اب کیا ہوگا۔ اب کیا ہوگا، نہیں معلوم کیا ہونے والا ہے" کرشن کمرے میں ٹہلتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔ پھر میرے شانہ پر ہاتھ رکھ کر بلند آواز سے بولا "میں نے کہا اب کیا ہوگا"

"آہا ہا۔ کیا شعر ہے، تعریف نہیں ہو سکتی، سنا تو نے کرشن" میں نے اُس کی بکواس کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا:

"اے سایۂ کاکل میں چمکتے ہوئے عارض"

"عارض اور کاکل کے جھگڑوں میں پھنسے رہو گے یا پیٹ کی بھی کچھ فکر کی جائیگی" کرشن نے پرچہ میرے ہاتھ سے چھین کر پھینکتے ہوئے کہا "اوں ہوں، بڑے بد مذاق ہو یار سارا مزہ کرکرا کر دیا" میں نے ناراضگی کے انداز میں کہا۔ "بھئی شعر تو سن لے، قسمت جاگ اُٹھیگی۔ واہ! کیا غضب کا شعر ہے "اے سایۂ کاکل میں چمکتے ہوئے عارض ؛ ظلمات میں آب خضر کس کے لئے ہے"

"میں نے کہا سرکار۔ شعر سے زیادہ آپ غضب ڈھا رہے ہیں" کرشن کے غصہ کا پارا کافی چڑھ گیا تھا "اب کیا ہوگا؟"

"ایسی کون آفت آگئی جو کمرہ سر پر اُٹھا لیا" میں نے کہا۔

"آفت" کرشن ٹہلتے ٹہلتے رک کر بولا "یوں کہو جان کے لالے پڑے ہیں، نوکری کا ٹھکانہ نہیں اور ساری پونجی صرف دو روپیہ پانچ آنے" میں نے بجھے ہوئے سگریٹ کو جلا کر لمبا کش لیتے ہوئے بولا "دو چار دن کے لئے اور بیفکری ہے بعد کی بات بعد میں دیکھی جائیگی"

"مذاق چھوڑ شاہد" کرشن نے عاجزانہ لہجہ اختیار کیا "کچھ کام کی بات سوچ"

"کام کی بات، میں سوچنے لگا" میرے خیال میں ...... نہیں نہیں ...... ہوں ...... ہاں ہاں ٹھیک۔ اچھا کرشن بیل کتنے میں ملیگا"

"بیل" کرشن چونک پڑا "یہی تیس چالیس میں مگر کریگا کیا"

"ارادہ تھا تیری سنگنی کا مدشالہ اس کی پیٹھ پر ڈال سینگوں میں سیندور لگا، ڈھول بجاتے گاتے نکلتے اور مزے سے زندگی گزارتے" میں نے فرش پر سے پرچہ اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"پھر وہی مذاق" کرشن پر ناامیدی چھا گئی تھی "کل تک نوکری نہ ملے تو ایکادشی کا برت شروع"

"اچھا ہی ہوگا، اسی بہانے کچھ مذہبی فرائض تو پورے ہونگے" میں نے کہا "کھانے کو ملے تو روزہ نہ برت"

"اچھی بات ہے تم پی کے جاؤ اور میں اپنی" کرشن اسٹو جلاتے ہوئے بولا۔

"میرا خیال ہے آجکل اخباروں میں انجمنوں کی دھوم مچی ہوئی ہے کیوں نہ ہم بھی ایک آدھ انجمن کی بنا ڈالیں" میں نے تجویز پیش کی۔

"انجمن کا مقصد؟" کرشن غور سے سنکر پوچھنے لگا۔

"بیکار طیلسانین سے ہمدردی اور اسی مناسبت سے اس کا نام 'یتیم خانہ انیس الگریجوئیٹس' رکھا جائے۔" میں نے تفصیلات پیش کیں۔

"یتیم خانہ وہ بھی گریجویٹس کا" کرشن چولہے پر پتیلی رکھتے ہوئے بولا "میں نہیں سمجھا کیا تمام گریجویٹس یتیم ہوتے ہیں"

"تم تو ہو بدھو" میں نے کہا "باپ اصل میں ہوتا ہے سہارا، یہ گذر جائے تو لڑکا یتیم کہلائے۔ اسی طرح جب گریجویٹ بیکار ہو تو وہ بھی بے سہارا ہے، اس لئے بیکار گریجویٹ اور یتیم میں کوئی فرق نہیں"

"مگر بیکاروں کی انجمن قائم کر کے ہمیں کیا ملیگا۔ یتیم خانہ والوں کی طرح بھیک تو نہیں مانگ سکتے۔ ایسا نہیں ہو سکتا تو ہم ان بیکاروں کی مدد بھی نہیں کر سکتے" کرشن نے حجت کی۔

"کیوں نہیں، ضرور کر سکتے ہیں، ذرا ہوشیاری کی ضرورت ہے، سب سے پہلے کسی اخبار کے ایڈیٹر کو گھیرنا پڑیگا۔ اُسے سمجھا بجھا کر کہیں گے، دیکھ بھیا معاملہ ذرا ٹیڑھا ہے، صبر سے کام لیں تو چاندی ہی چاندی ہے، میرا اپنا خیال ہے کوئی نہ کوئی مان جائیگا۔ اس کے بعد تم اور میں اس اخبار میں مختلف ناموں سے عقد بیوگان کی تائید میں زوردار آرٹیکل لکھیں گے۔ یہ سلسلہ دو ماہ تک جاری رہیگا، بعد ازاں اشتہارات شائع کرا دیں گے کہ ایک نوجوان برسر روزگار گریجویٹ کو رشتہ کی ضرورت ہے۔ لڑکی سلیقہ مند اور با اخلاق ہو۔ خوبصورت ہونا چنداں ضروری نہیں۔ بیوہ کو ترجیح دیجائیگی۔ تمام خط و کتابت بصیغۂ راز" تفصیل سے میں نے سمجھایا۔

"دلہن والے پوچھیں گے کہ لڑکا ملازم کہاں ہے" کرشن نے اپنا شبہہ ظاہر کیا۔

"کہدیں گے فلاں اخبار کا معاون مدیر ہے" میں نے اس کا شبہ رفع کیا۔

"مانا ایسا ہی ہوا۔ ہمیں کیا ملا" کرشن نے تو جان کھالی۔

"ارے ہمیں تو اس کی آدھی دولت ملیگی، جانتے ہو بیوہ کے پاس اس کے مرحوم یا آنجہانی شوہر کا پورا سامان زیور وغیرہ ہوگا کم از کم تین چار ہزار کی آسامی تو ہوگی، اِدھر ہمارے گریجویٹ نے شادی کی اُدھر میسر ہوں آدھی دولت حاصل، مہینے میں دو ہی شادیاں ہوں تو مستقل تین چار ہزار کی آمدنی ہوگی"

"ایک اور خامی ہے، دولھا میاں نے انکار کیا تو" کرشن نے پھر ٹانگ اڑائی۔

"مگر کیسے جائیں گے، پرامیسری نوٹ لے لیں گے شادی سے پہلے" میں نے یقین دلایا "اس دوران میں کوئی کنواری اور موٹی آسامی ہتھے چڑھ جائے تو ہم بھی بیاہ کرلیں گے"

"اپنے لئے کنواری دوسروں کے لئے بیوہ۔ بری بات ہے" کرشن نے طنز کیا۔

"دنیا کا یہی اصول شاہی ترجیح بن بیٹھا ہے"

"ایک بات اور" کرشن نے پیچھا نہ چھوڑا "جب تک آپ کی انجمن بنے اور کسی کی شادی ہو اور پیسہ آئے ہم گذارہ کیسے کریں ہمارے پاس تو اس وقت صرف دو روپیہ پانچ آنہ ہیں"

"یہ تو تم نے پتہ کی کہی، میں تو بھول گیا تھا کہ اس وقت ہم مفلس بھی ہیں اور بیکار بھی" میں نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی، ہر شے سے حسرت ٹپک رہی تھی، ہماری غربت اور کس مپرسی کا عالم بوسیدہ در و دیوار سے ہویدا تھا، اسے کمرہ کہتے شرم آتی ہے۔ بھٹیار خانہ اچھا ہوتا ہوگا، کچھ پھٹی پرانی کتابیں، دو چار رسالے، چند سڑے گلے سوٹ، خیال سا یہ غارت پنکچر ہونے والی ایک بائیسکل، ایک ٹوٹی ہوئی کرسی، اسی خاندان سے تعلق رکھنے والا ایک میز جو ڈریسنگ ٹیبل، رائٹنگ ٹیبل، ڈائننگ ٹیبل، سب ہی ٹیبلوں کے فرائض انجام دیتے دیتے وفاداری اور جانثاری کے صلہ میں وکٹوریہ کراس پاچکا تھا، بیکاری اور موت کے دم گھٹا دینے والے احساس کو بھلا دینے کے لئے ہم نے یہ کراس چاقو سے اس میز پر کھود اتھا۔

کرشن بچپن کا ساتھی تھا ہم دونوں کے مکانات ایک ہی محلہ میں تھے، ابتدائی تعلیم گاؤں میں حاصل کرنے کے بعد شہر سے میٹرک، انٹر اور بی۔ اے کیا۔ پورے چوبیس سال کی دوستی اور صحبت کی وجہ سے ہم دونوں کافی بے تکلف تھے۔ انٹرنس کی کامیابی ہمیں راس نہ آئی۔ یتیم تو تھے ہی پیگسمنے بیسر بھی کر دیا۔ بی اے کے بعد تلاش روزگار میں رہا ہے، ٹھانہ لٹا دیا لیکن نوکری نہ ملنا تھی نہ ملی۔ راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام ہو گیا تھا، دفتر، کچہریاں، کارخانے، ادارے سب ہی چھان ڈالے لیکن "نو ویکینسی" کے سوائے کوئی جواب نہ ملا۔ اس دوران میں کرشن کی علالت نے تو اور ہی غضب ڈھایا، اگر نوکری نہ ملتی تو کرشن کا گلا گھونٹ کر پھانسی سے لٹک جانے کی ٹھان لی تھی۔ اس کے سوائے چارہ ہی کیا تھا وہ تو کہیئے جیسے خدا رکھے اُسے کون چکھے، کرشن کی علالت خوشی کا پیغام لائی، دفتروں، کچہریوں اور کارخانوں کے راستہ چھوڑ کر میں نے چند دنوں سے بنگلوں اور کوٹھیوں کے چکر لگانا شروع کئے تھے۔ شاید کام مل جائے۔ آجکل کے روشن زمانہ میں عورتوں کو پرائیویٹ سکریٹری رکھنے کا شوق بہت عام ہے اپنے شوہروں کی غیر حاضری میں ٹیوشن پڑھنے یعنی انگریزی سیکھنے کا شوق بھی ماشاء اللہ کچھ کم نہیں۔ اسی امید نے میرے دھوسے سپنوں کی تعبیر دکھائی۔ ایک جگہ پرائیویٹ سکریٹری کی حیثیت سے رکھ لیا گیا، تنخواہ ایک سو ماہوار۔ یقین جانیے خودداری کا خون کر کے کرشن کی دوا دارو کے لئے ان جمالیاتی راہوں پر چلنا شروع کیا تھا، ٹال ٹالی اور بد لائی ماحول میں گھسنے کی کوشش کی تھی تو ایڈوانس مانگنے میں کیا عیب، پچاس روپیہ کرشن کے لئے جلد سے جلد منتقل ہونے کی تاکید کے ساتھ عطا ہوئے

میں ملازم رکھنے والی [illegible] لکھنا میں مناسب نہیں سمجھتا۔ کافی خوبصورت۔ عمر تیس کے لگ بھگ، اعلیٰ تعلیم یافتہ، شہر کے شہر رتنے کے بیوپاری کی بیوی۔ جس کی عمر اسّی سے اونچی ہو گی۔ اس کے شوہر کو پہلی بار دیکھ کر یہ اندازہ کیا تھا کہ ان دونوں کی شادی نہیں ہوئی ہو گی۔ سماج اتنا ظالم نہیں کہ اس رسیدہ المعمر بوڑھے سے ایسی نوجوان اور خوبصورت لڑکی کو بیاہ دے اسے تو کا [illegible] امیر لگ گیا ہو گا۔ ورنہ باپ بیٹی کا رشتہ میاں بیوی کا بندھن کیسے بن سکتا۔ اس کے ایک لڑکی بھی تھی۔ مجھے یقین نہیں لڑکی اس بڑھے کی ہو، بڑھے باور سے کا دماغ کسی سے جیون لی بنا نہیں رکھ سکتے۔ ہٹاؤ بھی، ہو گی کسی کی، کالی پیلی لڑکی اپنی تین سال کی نہیں تھی تھی، [illegible] سے میں نے پوچھا یہ لڑکی آپ کی ہے، اس نے ہاں کہی، میں جو سکا یا تو خفت مٹانے کو کہا یقیں۔ یہ لڑکی [illegible] نہیں سینہ سا مسئلہ ہے۔ آپ بھولتے ہیں اتوے کی پہلی روٹی کالی پیلی ہوتی ہے "

[illegible] دن [illegible] میں بیٹھا ڈائری لکھ رہا تھا۔ سامنے رکھی ہوئی گھڑی ساڑھے چھ بجا رہی تھی، کرشن نرس کے ساتھ [illegible] حالانکہ [illegible] کی حالت قدرے بہتر تھی، ہاں تو میں ڈائری لکھنے میں مصروف تھا۔ سیٹھانی آئیں اور میری کرسی کے پیچھے پر بیٹھ گئیں [illegible] چلو سا کیلی [illegible] ہوئی اس حالت میں سیٹھ نے دیکھ لیا تو؟ اندھیرے اور اجالے کے ملتے [illegible] سمجھ بیٹھے [illegible] اور عربی [illegible] رہی ہیں، دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا کہئے کیسے تشریف لائیں شاید بکھر کا ارادہ ہے "

"جی نہیں [illegible] بتھے سے اتر کر ٹھیک سے بیٹھتے ہوئے بولی" اکیلے میں جی گھبرا رہا تھا۔ سوچا کچھ دیر آپ سے باتیں کر لوں "

[illegible] رہی تھی اور نفرت دروازے سے تانا جوڑ رہی تھیں۔

"[illegible] سے محبت کی ہے" رانی نے اٹھلاتے ہوئے پہلو بدل کر پوچھا۔

"جی [illegible] آپ نے" میں تو سچ مچ بوکھلا گیا۔

"[illegible] کبھی پ[illegible] سے پیار کیا ہے، محبت کی ہے"

"محبت! [illegible] موت سے پیار ضرور کیا تھا، افسوس بڑی بے وفا نکلی"

"آپ تو مذاق [illegible] کہ آپ کو مجھ پر [illegible] نہیں، آپ کی سوگند کسی سے نہ کہوں گی۔"

"مذاق! یہ لفظ آپ کی زبان سے اچھا نہیں لگتا"

"کیوں؟؟"

"جانے دیجئے، آپ برا مانیں گی، کوئی اور بات کیجئے" میں نے گریز کرنا چاہا۔

"برا ماننے کی بھی ایک ہی رہی، میں ان عورتوں میں سے نہیں جو ذرا ذرا سی بات پر برا مانا کرتی ہیں۔ آپ کہہ ڈالئے!"

"آپ خود سماج کا اتنا بڑا مذاق ٹھہریں، بھلا آپ سے مذاق کر سکتا ہوں" میں نے اکتاتے ہوئے کہا۔

"اتنی سی بات۔ یہ تو حقیقت ہے، ہر شخص کو حقیقت کے اظہار کا حق ہے۔ فطری حق"

"مجھے افسوس ہے کہ لہجہ سخت اور تلخ اختیار کیا"

"اس کی وجہ یہ ہے کہ محبت کی تڑپ سے آپ کا دل عاری ہے، خشک فلسفی معلوم ہوتے ہیں آپ۔ کسی سے محبت کر دیکھئے بڑا ہی مزہ آتا ہے چاہنے اور چاہے جانے میں" سیٹھانی نے اٹھتے ہوئے کہا اور جاتے جاتے بتی جلا گئیں۔ خانۂ دل میں نیا اجالا پھیل گیا۔

دن گذرتے رہے، کوئی کام نہ کاج، البتہ شام رنگین جاتی، ندی کی سیر، کبھی تھیٹر، کبھی کلب یا پھر کچھ بھی نہیں۔ سیٹھانی کے کردار کا مطالعہ اس بات کی غمازی کر چکا تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ فیشن کی دلدادہ ہے، اس کے آگے کچھ نہیں۔

جاڑے کا موسم، ایک دن دوپہر کمرے میں سو رہا تھا، سیٹھ کی حالت نازک تھی، دمہ کے وہ شدید دورے پڑتے تھے کہ سانس اب اکھڑی کہ اب اکھڑی۔ میں بھی رات گئے تک جاگتا رہا، اسی لئے تھوڑی دیر ستانے کو لیٹا تھا کہ کرشن سوار ہوا۔ اس کے صحتیاب ہونے کے بعد سیٹھانی کی بہن کے بچوں کے ٹیوٹر کی حیثیت سے مقرر کروا دیا تھا۔ وہیں رہتا تھا، البتہ روزانہ شام کو ملاقات ہو جاتی۔ آج عین دوپہر آنا نئی بات تھی، پلنگ کی پٹی پر بیٹھ، سرہانے سے سگریٹ نکال کر جلایا اور گنگنانے لگا:۔

چارہ گری سر آنکھوں پر اس چارہ گری کے کیا کہنے
دردِ کہ لوٹی آپ دوا ہے تم سے اچھا کیسا ہوگا

یک دم رک کر بولا "سنا تو نے۔ سالی تو تڑنگ نکلی" مجھے اچنبھا ہوا، لیٹے لیٹے پوچھا "کون؟"

"وہی تیری سیٹھانی، تو سمجھتا ہے بیچاری پتی ورتا ہے، اس کے گن کیا جانے، پیٹ میں پاؤں ہیں پاؤں"

"رہا کریں مجھے اس سے کیا" میں نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا "یار کی یاری سے غرض"

"تیری ہنسی جو ہو رہی ہے، کلب میں تو بدنام، اس کی بہن تجھے اچھی نظروں سے نہیں دیکھتی، تو سمجھتا ہے تجھے سیٹھانی نے نوکر رکھا ہے اسے عقل کے گھوڑے، سیٹھ ان آدمیوں میں سے نہیں جو یہ چاہے کہ بھینس دن بھر جہاں سینگ سمائے چرا کرے شام تھان پر لوٹ آئے تو بس، سٹے کا بیوپاری ہے، ادھار کھلانا پاپ سمجھتا ہے، اپنی سالی کی مدد سے سیٹھانی کو کسا یا گیا کہ وہ اپنا سکریٹری رکھے جس کا مقصد یہ تھا کہ اس کی حرکات و سکنات پر نگرانی کی جا سکے، عزت پیاری ہے تو یہ نوکری چھوڑ ورنہ عزت سادات بھی گئی"

کرشن نے بکواس ختم کی۔

"یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ تجھے غلط فہمی ہوئی ہے، تجھ سے زیادہ میں سیٹھانی سے واقف ہوں۔ ایسی بھولی بھالی صورت اور یہ غلاظت۔ میں نہیں مانتا" میں نے کہا۔

"ہاں جی۔ تم کیوں مانو گے" کرشن نے طنز کیا "پریم کا بھوت جو سوار ہے سر پر، یہ نہ بھولنا کہ سنکھیا بھی سفید ہوتی ہے"

"شکریہ۔ میں اپنا برا بھلا خوب سمجھتا ہوں، آپ کی نصیحت کی ضرورت نہیں، مہربانی کر کے تشریف لے جائیے" کرشن کے خلاف نفرت کے جذبات شدید تھے۔

"جانے کو تو میں چلا، لیکن پھر کہتا ہوں تم بدھو ہو، وہ تمہیں اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کا آلہ کار بنائے ہوئے ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان پریم یا محبت کو صرف ایک رنگین آرزو سمجھتی ہے۔ گڈ بائی" کرشن چلا گیا۔

اس واقعہ کے چوتھے روز سیٹھانی نے اپنے کمرہ میں طلب کیا، دن ڈھل رہا تھا، پوربی افق پر سرخی چھا رہی تھی سرخی ــــ ہزاروں بے گناہوں کا خون، افق کے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ سیٹھانی غیر معمولی طور پر خوش تھیں، مہین کریپ کی ساری ستر ڈھانک رہی تھی۔ غلط۔ وہ تو کہو بیچارہ لہنگا جیا بن کر بیچ بچاؤ کر رہا تھا، ورنہ چشم یار نے تو دشمن کو دھاوا بول دینے کی چھوٹ دے رکھی تھی۔ اسی کپڑے کا جدید طرز پر سلا ہوا بغیر آستین کا بلاؤز جس کے نیچے سے سیاہ رنگ کا نرم و نازک "سینہ داب" حسن کا نیا معیار قائم کر رہا تھا، نہیں معلوم اس لفظ معیار کو کس نے ایجاد کیا ـــــ اور ان معیاروں کو قائم کرنے والی ہستیاں کون ہیں، یہ بھی ضرور سٹے کے بیوپاری ہونگے۔ کتنے معیار قائم کر دیئے، معیار حسن: حیا کا خون ـــــ معیار اخلاق: شوہر کے سامنے بیوی غیر مرد سے بوس و کنار کرے، ـــــ معیار تہذیب: کلب گھروں میں ننگے ناچنا ـــــ معیار علماء: محمد تغلق کو پاگل ٹھہرا کر خود اس سے زیادہ پاگل پن کی حرکتیں کرنا۔ خیر۔ ذکر تھا سینہ داب کا۔ واقعی کالے کالے ہاتھوں کی بنی ہوئی چولیاں، اس قابل نہیں کہ ان کے سینہ کی شوبھا بن سکیں۔ نازک سی جلد چھل جائے گی نا۔

"پلازا میں جان ہال کا نیا پکچر شروع ہوگا، آپ جا کر دو سیٹ بک کرالیں، میں شانتی ہوتے ہوئے آؤنگی" سیٹھانی نے روپئے دیتے ہوئے کہا۔

میں سوچنے لگا کیا واقعی کرشن ٹھیک کہتا ہے کہ وہ ترڈنگ ہے، نہیں تو جان ہال کا نام کیوں لیتی، میریا مونٹیز بھی تو کام کر رہی ہے، یہ بات نہیں، عام طور پر مرد عورتوں کو ترجیح دیتے ہیں اور عورتیں مردوں کو۔ جان ہال کا نام لینے میں قباحت ہی کیا ہے، وہ بیچارہ تو ہزاروں میل دور سمندر پار ہے۔

پکچر شروع ہوا، لیکن وہ نہیں آئیں۔ شاید شانتی میں مصروف ہونگی، شانتی کلب گھر کا نام تھا گھر سے زیادہ انھیں شانتی میں شانتی ملتی تھی، انٹرول بھی ہوا، وہ نہ آئیں، تشویش ہونے لگی۔ سینما ہال سے باہر نکلا شانتی پہنچا۔ معلوم ہوا آئی تھیں دو دن چلی گئیں گھر ٹیلیفون بھی نہیں کر سکتا تھا، فون سیٹھ کے کمرہ میں تھا، وہ ناراض ہوگا کہ، کیلئے کیوں جانے دیا۔ سوچا طبیعت بگڑ گئی ہوگی۔ بڑے آدمیوں کے نخرے بھی بڑے، گھر چلی گئی ہونگی۔ گھر پہنچا، گیٹ پر مالن مالی کی راہ تک رہی تھی، اس نے بھی لاعلمی ظاہر کی میری نظر یکا یک اپنے کمرے کی طرف اٹھ گئی۔ اندر روشنی ہو رہی تھی۔ ہنسنے اور باتیں کرنے کی بھی آوازیں آ رہی تھیں۔ قریب پہنچا سیٹھانی کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ میرے کمرہ میں وہ کیا کر رہی ہیں، اکیلے میں باتیں کرنا تو پاگلوں کا کام ہے، وہ پاگل نہیں تو اور کون ہے۔ سیٹھ ــــ سیٹھ تو کبھی ادھر نہ آیا۔ اسے کیا پڑی کہ اپنی بیاہتا بیوی سے میرے کمرہ میں یوں محو تکلم ہو۔ تو اندر ضرور کوئی اور ہے۔ کرشن تو نہیں۔ میرا ماتھا ٹھنکا ــ ہو نہ ہو ہوگا ـــــ مگر ہاں وہ جاگیر گیا ہوا ہے لگان وصول کرنے۔ باتوں کی آواز گم ہوگئی تھی، ایک نئی قسم کی آواز سنائی دینے لگی، جیسے کوئی مصیبت سے کراہتا ہو، دروازے میں سے جھانکنے لگا، کچھ بھی نظر نہ آیا۔ سوائے سامنے دیوار پر عجیب سائے جلدی جلدی حرکت کر رہے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا اسکرین کی پیچھے بیٹھا پکچر دیکھ رہا ہوں۔ میں جھانک رہا تھا، خود اپنے کمرہ میں۔ پیچھے سے کسی نے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "شاہ زمانی کہاں ہیں؟" یہ سیٹھ تھا، خوف کی سرد لہر تن بدن سے دوڑ کر نکل گئی، جیسے کسی نے ریفریجریٹر میں بند کر دیا ہو، سیٹھانی کسی اور کے ساتھ اندر سیٹھ کو معلوم ہو تو نوکری اور عزت دونوں برطرف، ہمت کر کے بولا "وہ تو سینما گئی ہیں"

"تم ساتھ نہیں گئے" سیٹھ کو غصہ آ رہا تھا۔

"جی۔ ہاں۔ میں بھی گیا تھا کھیل ختم ہونے پر ان کی مسلمان سہیلی مل گئیں، وہ انھیں گھر پہنچانے چلی گئیں، اور مجھے یہاں

چلنے کو کہا" میرا روؤاں روؤاں کانپ رہا تھا۔

" اندر کون ہے، تم جھانک کیوں رہے تھے "

" اندر۔ ہاں۔ اندر کرشن ہے، اسے کبھی کبھی پاگل پن کا دورہ پڑتا ہے تو پولو کھیلنا شروع کر دیتا ہے"

" پولو، نہ گھوڑا، نہ میدان، یہ کیسا پولو۔ میں بھی تو دیکھوں " سیٹھ آگے بڑھنے لگا۔

"گھوڑا، میدان، سب کچھ ہے، خدا کے لئے آپ وہاں نہ جائیے، آپ کا گلا گھونٹ دیگا، مجھے دیکھئے، اس کا دوست، جانے سے ڈرتا ہوں" سیٹھ کو جانے سے روکتے ہوئے بولا۔

اتنے میں اندر کی روشنی گل ہو گئی " یہ دیکھئے اس کا کھیل ختم ہوا، اب باہر نکلے گا، اپنے کمرے میں چلئے، یہاں سردی زیادہ ہے، آپ کی طبیعت نہ بگڑے، آپ کا حکم ہو تو جا کر ابھی سیٹھانی کو بلا لاؤں" میں نے سیٹھ کو اس کے کمرہ کی طرف لیجاتے ہوئے کہا۔

" تم کہاں مارے مارے پھروگے، وہ خود آ جائیگی، دیکھو ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔ اپنے دوست کا علاج کرواؤ۔ پولو ——— نہ گھوڑا نہ میدان ——— ہش " سیٹھ بڑبڑا رہا تھا۔

واپس لوٹ رہا تھا کہ سامنے آم کے جھنڈ میں ایک سایہ بھاگتا ہوا نظر آیا، یہ جگندر تھا، مشہور بنکر کا عیاش لڑکا، سیٹھانی کمرے کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی، مجھے دیکھ کر کہا " شکریہ شاہد صاحب، آپ نے تو کمال کر دکھایا، آخر گریجویٹ ہونا۔ آج سے تنخواہ میں پچیس روپیہ اضافہ اور میری طرف سے یہ تحفہ، ہیرے کی انگوٹھی اپنی انگلی سے اتار کر میری انگلی میں پہنا دی۔

"بہت برا کیا، آپ سے یہ امید نہ تھی" میں کہہ ہی گیا۔

" اور کیا امید تھی۔ ایک ہندستانی لڑکی سے، اس گرم ملک کی رہنے والی سے، جہاں بارہ سال کی عمر میں لڑکیاں جوان ہوتی ہیں اور بیس بیس سال تک ماں باپ کی اونچی ناک پر قربان ہوتی رہتی ہیں۔ اس وقت آپ کی عقل کہاں گئی تھی، جبکہ ایک روشن خیال تعلیم یافتہ، پچیس سال کی جوان عورت کو اسی سال کے بڈھے سے بیاہا جا رہا تھا، یہی مقصود تھا کہ گھٹ گھٹ کر ماں باپ کی ناک پہ قربان کر دی جاؤں تو تعلیم کیوں دلائی، کسی نے یہ سوچا کہ گرم ملک کی گرم فطرت لڑکی کے جذبات کی تسکین کیا یہ بڈھا پا کر سکتا ہے۔ دھن دولت ہی سب کچھ نہیں۔ شادی سے پہلے کسی غیر مرد کا خیال بھی میرے لئے پاپ تھا، شادی کے بعد جب میں نے اصلیت کو جانا تو جذبات کے امنڈتے ہوئے سیلاب میں بہہ جانے کے سوائے چارہ ہی نہ تھا۔ ساتھ ساتھ آپ لوگوں سے انتقام بھی لینا تھا۔ شکر کیجئے کہ ابھی میرے جسم میں مشرقی خون کی چند بوندیں باقی رہ گئی ہیں، جو چوری چھپے انتقام پر مائل کرتی ہیں، ورنہ کھلے بندوں ان لمبے لمبے تلک لگانے والوں کے سامنے بھی کر گذروں تو دل کی آگ نہ بجھے، عورت کی ادنیٰ لغزشوں کو پتہ میں باندھنے والے کمزور انسانو، مجھ سے تو باز پرس کر رہے ہو، یہی سوال جگندر سے کر دیکھو، اسے مورد الزام کیوں نہیں ٹھہراتے، گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو پتہ کس کا بھاری ہے۔ شاہد صاحب آپ انجان آدمی ہیں، آپ سے شکایت نہیں، اس کا برا نہ مانیں"

میں کچھ نہ بول سکا، وہ چلی بھی گئی، پھر ریفریجریٹر (Refregerator) میں بند تھا، کچھ طے نہ کر سکا ——— کون ترنگ میں ہے۔ رانی ——— یا ——— سماج ——— یا ——— سماتی۔

~~~
~~~

شریف عنایت اللہ

چڑیا کا غلام

میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ایک عرصہ سے ارادہ کر رہا تھا کہ تم سے کچھ کہوں، لیکن جب کبھی ہمارا سامنا ہوتا مجھ پر ایک جمود سا طاری ہو جاتا اور نہ جانے کیوں میں کچھ بول نہ سکتا، میری آنکھیں تمہارے حسین چہرہ کا جائزہ لینے لگتیں، اور تم میری پروا کئے بغیر، ہمارے بند صحن کو نظر انداز کرتے ہوئے، دنیا کی ریت کو ٹھکراتے ہوئے، میرے پاس سے گذر جاتے، اور میں پہروں تمہارے نقش پا کو ٹکٹکی باندھے گھورتا رہتا۔ میں نے ہزاروں بار ارادہ کیا کہ تم سے تنہائی میں ملوں، اور تمہارے سامنے اپنی دکھ بھری کہانی پیش کروں گڑگڑا گڑگڑا کر تم سے وہ مسرت مانگوں جو مجھ سے چھین لے گئے تھے، تم نے میری واحد ملکیت مجھ سے لوٹ لی ہے، جس پودے کو میں نے اپنے خون جگر سے سینچا تھا اسے تم نے اپنے بے رحم بوٹوں سے روند ڈالا ہے، اسے میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ میں نے زندگی کی کشمکش میں اپنا سب کچھ کھو دیا تھا لیکن پھر بھی میں خوش تھا، میرے خشک ہونٹوں کی مسکراہٹ جو بچ رہی تھی، میرے دل کا سکون جو باقی رہ گیا تھا، اپنے تاریک مستقبل میں، ایک کرن جو بچ رہی تھی، لیکن نہ جانے کیوں تمہیں میری یہ مسرت ایک آنکھ نہ بھائی۔ اور تم نے، اپنے ظالم ہاتھوں سے میری خوشیوں کی کلیاں مسل ڈالیں، میرے دل کا سکون لوٹ لیا، میرے ہونٹوں کی مسکراہٹ مجھ سے چھین لی، تم چار سال کی غیر حاضری کے بعد گھر واپس آئے، اپنے ساتھ میری رہی سہی مسرتوں کی بربادی کا طوفان لے آئے، ہماری آنکھیں تمہارا انتظار کرتے کرتے پتھرا گئیں تھیں۔ ہم بیقراری کے ساتھ اس دن کے منتظر تھے جب تم اپنی تعلیم پوری کرنے کے بعد گھر واپس آتے، ہمارے لئے محبت اور خوشیوں کا تحفہ لئے ہماری چھوٹی سی، افسردہ دنیا پر مسرت بن کر چھا جانے کے لئے ــــ لیکن آج جب ہماری دنیا پر بربادی کی گھنگھور گھٹائیں چھا گئی ہیں، اور جب کل شام میری زندگی کی واحد کرن بھی مجھ سے چھین لی جائیگی۔ مجھے یہ سب باتیں یاد آتی ہیں تو دل بے اختیار ہنسنے کو چاہتا ہے، اتنا ہنسنے کو کہ قسمت کا تمسخر آمیز قہقہہ اس میں دب کر رہ جائے، گم ہو کر رہ جائے۔

کہاں میں اور کہاں شاہدہ ــــ اس کے لائق تو بس تم ہی ہو تعلیم یافتہ، قبول صورت، دولتمند۔ تمہارے مقابلہ میں میرے پاس بھلا رکھا ہی کیا ہے، نہ شکل، نہ صورت۔ ایم اے کی ڈگری سو وہ بھی کسی کام نہ آئی، دو آنکھیں تھیں وہ بھی دن رات کی پڑھائی کی نذر ہو گئیں۔ یاد ہے تمہیں ڈپٹی صاحب نے ایک دن کیا کہا تھا؟ تمہیں شاید نہ یاد ہو، لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے [illegible] کیسے یاد نہیں رہتا جب اس دن تم نے پہلی بار میرے منہ پر طمانچہ رسید کیا تھا۔ پہلی بار مجھے ایک نیا خطاب عطا کیا تھا ڈپٹی صاحب کے یہ کہنے پر کہ ان کی شاہدہ کسی پروفیسر کے گھر جائیگی۔ امی نے یہ تمنا ظاہر کی تھی کہ جاوید ایک دن ضرور پروفیسر بنے گا اور شاہدہ کو وہ اپنے گھر بیاہ لائیں گی۔ تم نے اس پر قہقہہ لگایا تھا ــــ "اسے یہ جاوید بے حد احمق ہے امی۔ بھلا یہ پروفیسر کیا بنے گا، اور اگر یہ ہو بھی گیا تو بھلا شاہدہ کو یہ چڑیا کا غلام پسند بھی آئیگا؟ ــــ" تمہاری یہ باتیں [illegible] ہنس پڑے تھے اور میں وہیں سب کے سامنے رونے لگا۔ اس دن کے بعد میرے دل میں بس ایک آرزو تھی کہ [illegible] تھی اور وہ تھی پروفیسر بننے کی۔ میری منزل ایم اے کی ڈگری نہیں تھی، ایک اچھی ملازمت نہیں تھی، [illegible] مستقبل نہیں تھا بلکہ میری منزل تھی شاہدہ، اس کا تصور میرے احساسات پر بری طرح چھایا رہا۔ کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرتا تھا جب اس کا خیال میری آنکھوں میں نہ چھایا رہتا ہو، اس کے متعلق [illegible] کچھ سوچتا ہی اور پھر ایک دن ایسا بھی آیا، جب میں نے ایم اے فرسٹ کلاس کیا۔ مجھے پروفیسر [illegible] پڑھائی نے

مجھ سے میری صحت چھین لی، میری بینائی کمزور ہو گئی اور میں چشمہ لگانے لگا، ان حوصلہ فرسا اور صبر آزما حالات کے باوجود میری خاموش محبت یونہی مہکتی اور پھولتی رہی۔ اپنے تاریک مستقبل میں امید اور مسرت کی صرف ایک کرن تھی جس نے ہمیشہ میری عزت افزائی کی جو ہمیشہ مجھے بہلاتی رہی کہ ایک نہ ایک دن کامیابی میرے قدم ضرور چومے گی اور شاہدہ ہمیشہ کے لئے میری ہو گی، لیکن وہ باتیں جیسے اب افسانہ ہو گئیں۔ کسے معلوم تھا کہ تم ــــ میرے بھائی آندھی کی طرح ہماری محبت کی دنیا پر چھا جاؤ گے اور غریب کی پونجی یوں ہنسوں میں لوٹ لے جاؤ گے۔ تم دولتمند ہو، بڑے عہدے پر ہو۔ تمہارے لئے لڑکیوں کی کمی نہیں۔ شاہدہ کو یوں مجھ سے دور لیجانے سے پہلے کبھی اس غریب کا بھی حال کیا ہوتا جس کی اندھیری زندگی کی شاہدہ ہی ایک کرن ہے۔ میری مسرتوں کی دنیا یوں برباد کرنے سے پہلے اپنے اس بھائی کا بھی خیال کیا ہوتا جس کے لئے بغیر شاہدہ کے زندہ رہنا ممکن نہیں۔ پتہ نہیں تمہیں میرے دل کا راز معلوم بھی ہے یا نہیں۔ پتہ نہیں شاہدہ کو میری اس خاموش محبت کا راز معلوم بھی ہے یا نہیں۔
کئی بار ارادہ کیا کہ تمہارے سامنے اپنا دامن پھیلا دوں اور بھیک کے طور پر اپنے دل کا سکون واپس مانگ لوں۔ لیکن نہ جانے کیوں میری ہمت میرا ساتھ نہیں دیتی۔ تمہارے بارعب چہرے کو دیکھ کر ہر بار میرا دل خود بخود بیٹھنے لگتا ہے اور میں اپنا ارادہ ترک کر دینے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ اپنے دل کا راز شاید قیامت تک میں سینے ہی میں چھپائے رکھتا لیکن آج جی بُری طرح چاہتا ہے کہ تم سے صرف ایک بار دل کھول کر باتیں کر لوں۔ نہ جانے پھر موقع ملتا بھی ہے یا نہیں۔ کل ہی تمہاری دنیا ہی بدل جائیگی۔ کل امی تمہیں اپنے ہاتھوں سے دولہا بنائیں گی اور پھر بینڈ کی دھن پر۔ بزرگوں کے شور و غل میں تم بارات کے ساتھ شاہدہ کے گھر جاؤ گے۔ مولوی قاضی کے دو بول تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے شاہدہ کا مالک بنا دیں گے۔ اب تو بس چوری چھپے شاہدہ کو جی بھر کر دیکھ لیا کرتا ہوں۔ کل سے میں اُسے دیکھ بھی نہ سکوں گا۔ اس سے باتیں کرنا تو خیر میری قسمت میں ہے ہی نہیں۔ اکثر میں نے اُسے جی بھر کر چھپ چھپ کر دیکھا ہے۔ لیکن سماج اور دنیا کی نظروں میں اب یہ گناہ ہو گا۔ وہ میری بھابی کہلائیگی اور بھابی سے محبت گناہ نہیں تو اور کیا ہے؟
تمہیں شاید بہت سی باتیں یاد نہیں شروع ہی سے تمہاری یادداشت ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن مجھے میری زندگی کا ایک ایک واقعہ یاد ہے۔ اب یہی یادیں تو رہ گئی ہیں میرے پاس، یہی تو ہیں اب میری زندگی کا سرمایہ، ان کے علاوہ اب رکھا ہی کیا ہے میری زندگی میں جبکہ تمہارے بیدرد ہاتھوں نے نوچ لیا، اس کے لئے مجھے تم سے شکایت نہیں شکوہ نہیں، جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا، جو ہو رہا ہے اچھا ہی ہو رہا ہے۔ تمہاری اور شاہدہ کی جوڑی کتنی اچھی رہیگی، تمہارے آنے سے پہلے امی نے بھی یہی کہا تھا۔ باجی کی بھی یہی رائے تھی۔ صرف بلقیس نے میری حمایت کی تھی، لیکن اس بچی کی بھلا آج تک کسی نے بھی سنی۔ سب نے اس کا مذاق اڑایا ــــ اس پر ایک تھپڑ۔ میں نے باجی کی باتیں سن لی تھیں۔ خود اپنی بہن کو مجھے "چڑیا کا غلام" کہتے سنکر میرا دل بیٹھ گیا، تم تو جانتے ہی ہو میں بچپن سے بڑا کمزور دل واقع ہوا ہوں۔ اس دن بھی بڑی کوشش کے باوجود بھی ضبط نہ کر سکا، میری آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔ جب میرے متعلق باجی کی یہ رائے ہے تو پھر غیر تو غیر ہی ٹھہرے۔ اس دن کے بعد میں پھر کبھی شاہدہ سے تنہائی میں نہ مل سکا۔ میری زندگی میں ایک عجیب بے ترتیبی آ گئی۔ اور پھر اس کی سالگرہ کا دن آ گیا۔ میں نے ایک سال سے اس دن کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ میں نے شاہدہ کو تحفہ دینے کے لئے اپنی جیب خرچ سے ایک ننھا سا فاؤنٹین پین بھی خرید رکھا تھا، اس دن صبح ہی سے میں نے تیاریاں شروع کر دیں۔ گھسے جوتوں کو پالش لگایا۔ اپنی شیروانی پر گرد صاف کی۔ اور خود ہی استری کی۔ دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ آج ایک برس کے بعد میں اس سے ملنے والا تھا۔ لیکن جب باجی سے پتہ چلا کہ تم بھی میرے ساتھ پارٹی میں جاؤ گے تو نہ جانے کیوں مجھ پر اداسی چھا گئی، احساسات تھکے ہوئے اور مضمحل سے معلوم ہونے لگے، حسب معمول میری ہمت نے میرا ساتھ چھوڑ دیا، میں گھنٹوں خاموش بیٹھا اپنی کمزور آنکھوں کو دور خلا میں

نہ جانے کیا دیکھتا رہا، اگر باجی وقت کا احساس نہ دلاتیں تو شاید میں پارٹی میں بھی نہ جا سکتا۔ آج سوچ رہا ہوں، کاش اس دن میں تمہارے ساتھ پارٹی میں نہ جاتا، میری محبت کی سنہری دنیا مجھ سے اس قدر دور تو نہ چلی جاتی، میں ابھی کپڑے بدل ہی رہا تھا کہ تم میرے کمرہ میں چلے آئے، ایسے تم میرے کمرہ میں بہت کم آتے ہو، شاید تمہارے غریب بھائی کے کمرہ کی فضا ہی کچھ ایسی ہے کہ یہاں تمہارا دم گھٹنے لگتا ہے، لیکن اس شام نہ جانے کیسے تم بھٹکتے میرے کمرہ میں آ گئے۔ تم نے ایک بہت ہی قیمتی گرم سوٹ پہن رکھا تھا، اس نئے سوٹ میں تم بہت شاندار معلوم ہو رہے تھے، میری آنکھوں نے تمہیں دیکھا اور وہ جھک گئیں۔ مجھے اپنے جسم میں ہلکے سے ارتعاش کا احساس ہوا ——— "ارے تم اب تک تیار نہیں ہوئے؟ آخر کب چلو گے شاہدہ کے یہاں؟ اور یہ تم نے کس زمانہ کی شیروانی نکالی ہے؟ اگر اسی آثار قدیمہ کے ساتھ چلنا ہے تو بس مجھے بخشو، میں تنہا چلا جاؤں گا ———"

اور تم چلے گئے، تم ٹھہر کر بھی کیا کرتے۔ میرے پاس رہی تو ایک شیروانی ہے، کیا ہوا جو اس کا کالر میلا تھا۔ کیا ہوا جو اس کے دو بٹن غائب تھے، میں نے اس شیروانی کو عید بابات کے لئے رکھ چھوڑا تھا۔ آج کا دن بھی میرے لئے عید ہی تو تھا، تمہارے چلے جانے کے بعد اپنی بیکسی پر میری آنکھوں میں آنسو چھلک آئے، تم نے ٹھیک ہی تو کہا تھا، مجھے کیا حق تھا کہ ایک بوسیدہ شیروانی میں ملبوس یوں ایک گورنمنٹ افسر کے ساتھ پارٹی میں جا کر ان کی بیعزتی کا باعث بنتا۔ میری ہمت نے پھر میرا ساتھ چھوڑ دیا لیکن دل نے نہ مانا۔ آج اس کی سالگرہ تھی۔ میں اس سے دور کیسے رہ سکتا۔ میں جب وہاں پہنچا اس وقت تم شمع محفل بنے ہوئے تھے شاہدہ تمہارے قریب بیٹھی تمہاری باتیں بڑے غور سے سن رہی تھی، اس نے میری مبارکباد کا صرف سر ہلا کر شکریہ ادا کیا۔ اس کے پاس مجھ جیسے ادنیٰ قسم کے مہمان سے بات کرنے کے لئے وقت نہ تھا۔ وہ اوروں کے ساتھ تمہاری باتیں سنتی رہی۔ کسی نے مجھ سے یہ نہ پوچھا کہ بھئی! یوں خاموش کیوں بیٹھے ہو؟ کچھ کہو نا! دیکھو۔ سب ہنس رہے ہیں، چہک رہے ہیں، پھر تمہاری یہ خاموشی کیسی؟ ——— سب تمہاری باتیں سنتے رہے، شاہدہ کے پہلو میں تم بڑے بھلے معلوم ہو رہے تھے، سب کی نظریں تم دونوں پر تھیں، سب نے تم دونوں کو گھیر رکھا تھا، نہ جانے کیوں مجھ سے وہاں ٹھہرا نہ گیا۔ شاہدہ کو میں تمہارے پہلو میں دیکھ نہ سکا۔ اب اسے تم میری کمزوری ہی کیوں نہ کہو وہاں میرا دم گھٹنے لگا اور میں کھلی ہوا میں چلا آیا۔ اس رات فضا بھی کچھ اداس سی تھی۔ ہر طرف ایک پُر اسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی، چاند نے بھی آج بادلوں کی اوٹ میں منہ چھپا لیا تھا۔ میرا تحفہ اب تک میرے سینہ ہی سے لگا ہوا تھا۔

تم سب ڈائننگ ہال میں تھے، سب ہنس رہے تھے، مہمانوں کے قہقہوں میں مجھے شاہدہ کی دبی دبی سی ہنسی سنائی دی تب ڈرائنگ روم پہنچا اور میری آنکھیں کمرہ کا جائزہ لیتی ہوئی گول میز پر رک گئیں، ٹیبل پر تحفے رکھے ہوئے تھے، کسی نے تحفے کا ارپیش کیا تھا تو کسی نے کتابیں، تم نے ایک بہت ہی قیمتی انگوٹھی پیش کی تھی، یاد ہے تمہیں تم نے تحفے کے ساتھ کارڈ پر کیا لکھا تھا؟ ——— "اس کی خدمت میں جنہیں مجھے بہت پسند ہے" تمہارا تحفہ میرے ہاتھوں میں کانپنے لگا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے، کمرے کی دیواریں ہل رہی تھیں، مجھے اپنے چاروں طرف تاریکی سی پھیلتی معلوم ہوئی۔ تو شاہدہ تمہیں بہت پسند تھی! ——— اسی لئے آج اس قدر خوش تھے اور وہ بھی تو خوش تھی۔ ساری دنیا خوش تھی۔ ایک میں ہی بدقسمت تھا جس کے دل میں یاس و ناامیدی کے جذبات موجزن تھے، میں تمہیں، ایک بے جان بت کی طرح وہیں کھڑا تھا کہ شاہدہ کمرے میں آ گئی ——— "ارے جاوید تم یہاں؟ امی تمہیں ڈھونڈ رہی تھیں" اس نے کہا۔ اس کی نظریں مجھ پر تھیں اور آج پہلی بار میں نے اسے غور سے دیکھا، کتنی حسین تھی وہ۔ اس نند سی روشنی میں وہ ایک شعلہ نظر آ رہی تھی۔ اس کے سوال پر میرے منہ سے کچھ نہ نکلا۔ میں نے مہینوں جس دن کے لئے ریہرسل کیا تھا وہ سب بیکار ثابت ہوا۔ میرے خشک ہونٹ کانپ کے رہ گئے، منہ سے آواز تک نہ نکل سکی، زبان سے ایک لفظ بھی نہ کہا گیا، میری نظریں جھک گئیں اور میں نے خاموشی سے

اپنا تحفہ پیش کیا۔ اس نے بھی خاموشی سے لے لیا ــــ " آخر اس کی ایسی ضرورت بھی کیا تھی ــــ " اور اس نے فوٹن پین بغیر دیکھے ٹیبل پر پھینک دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میرا تحفہ نہیں بلکہ میرا دل کسی نے پیروں تلے روند ڈالا ہے۔ جیسے کسی نے میرے مچلتے جذبات کا گلا گھونٹ ڈالا ہے۔ آج پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ میری ذات کس قدر غیر اہم ہے۔ آج پہلی بار مجھے اس کرب انگیز حقیقت کا احساس ہوا کہ میں اس کے لئے کچھ بھی تو نہ تھا، تم ہی اس کے لئے سب کچھ تھے۔ اور جب تم سب شاہدہ کو ڈھونڈتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو تم اسے میرے قریب دیکھ کر ٹھٹھکے۔ لیکن کاش تمھیں اس بات کا اندازہ ہوتا کہ وہ میرے قریب ہوتے ہوئے بھی مجھ سے کسی قدر دور تھی، جیسے آسمان پر چمکنے والا چاند اور زمین پر اس کے تصور میں تڑپنے والا ایک ننھا سا معصوم بچہ۔ اس نے مسکرا کر تمھیں دیکھا اور تمھارے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ کھیلنے لگی ــــ " بھئی جاوید! تم یہاں ہو؟ ہم تو تمھیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئے ــــ دوستو!! آج حضرت جاوید، شاہدہ کی سالگرہ کے موقع پر ایک تقریر فرمائیں گے ــــ " اور تمھارے دوستوں کی چیخوں سے کمرہ گونجنے لگا، صرف میں اور شاہدہ خاموش تھے۔ جانتے ہو میں کیوں خاموش تھا؟ میری خاموشی کی وجہ تمھارا طنزیہ لہجہ تھا۔ اگر یہ شاہدہ کہتی تب مجھے زیادہ دکھ نہ ہوتا، اگر سلیم یہ کہتا تو مجھے شکایت نہ ہوتی، آخر وہ غیر ہی تو تھے۔ لیکن تم ــــ میرا اپنا بھائی جو مجھے جان سے زیادہ عزیز تھا آج میرا یوں مذاق اُڑا رہا تھا، بیگم مراد نے مہمانوں کی خاطر تواضع کا انتظام تو بہت اچھا کیا تھا، کمی تھی تو صرف ایک بندر کی جو اپنے کرتبوں سے مہمانوں کا دل بہلاتا، تم نے اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے بڑے فخر سے اپنے دوستوں کی خدمت میں مجھے پیش کیا تھا۔ میری روح میں شعلے سے بھڑکنے لگے۔ میرا سویا ہوا وقار جاگ اٹھا وہ طوفان جو برسوں سے میرے سینے میں متلاطم تھا، آج آتش فشاں سے نکلے ہوئے لاوے کی طرح میرے جسم سے پھوٹ نکلا، تم اور تمھارے مہذب دوست بندر کا تماشہ دیکھنا چاہتے تھے اور میں تمھیں تماشہ دکھانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرا کھڑا ہونا تھا کہ سلیم نے اور اختر نے اور روجو نے سب نے تالیاں پیٹیں۔ صرف شاہدہ خاموش تھی اور بیگم مراد خاموش تھیں۔ اور تم خاموش تھے، تم کیسے نہ خاموش رہتے۔ تمھاری توقع کو ایک غیر محسوس سی ٹھیس لگی تھی۔ تمھارا خیال تھا کہ میں کچھ بول نہ سکوں گا۔ اسٹیج پر آنے کے بعد میرے پیر کانپنے لگیں گے۔ اور گھبراہٹ کی وجہ سے میرے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکل سکیگا لیکن تمھارا یہ چڑیا کا غلام سچ مچ کچھ کہنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا تھا ــــ " معزز مہمانو! آج مس شاہدہ کی سالگرہ ہے۔ آئیے ہم سب مل کر دعا کریں کہ خدا ایسے ہزاروں دن ان کی زندگی میں لائے :-

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

یہ تو تھی سالگرہ کی مبارکباد، اب پروگرام کے مطابق آپ کی خدمت میں ایک بندر کا ناچ پیش کیا جائیگا، ایک گنوار کا تماشہ پیش کیا جائیگا۔ پیش کرنے والے ہیں چڑیا کے غلام ــــ یعنی یہ خاکسار۔ آپ کے معزز دوست حضرت جمال کی فرمائش پر یہ پروگرام پیش کیا جا رہا ہے۔ لیکن پروگرام شروع کرنے سے پہلے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ معزز خاتون! آپ سے (شاہدہ سے) جناب جمال آپ سے، اور مسٹر سلیم! آپ سے، اور معزز حاضرین آپ سب سے۔ آپ کس طرح کا تماشہ پسند کرتے ہیں؟۔ پہلے بندر کا ناچ دیکھئے گا یا گنوار کے کرتب؟ آپ سب کی خوشنودی کا خیال رکھنا میرا فرض ہے۔ کہئے کیسا تماشہ پسند کرتے ہیں؟ اگر یہ آپ کو پسند نہیں تو پھر آئیے آج ایک ایسا تماشہ پیش کیا جائے جو ہماری دنیا میں، ہمارے گھروں میں ہم سب کے یہاں روز ازل ہی سے کھیلا جا رہا ہے۔ جس میں ایک انسان دوسرے انسان کا گلا بڑی بے تکلفی سے گھونٹتا ہے بڑی بیدردی سے دوسرے کمزور انسانوں کو اپنے پیروں تلے روندتا ہے، ان کے جذبات کا خیال کئے بغیر ان کی غربت کا

خیال کئے بغیر، انسانیت کے حقوق کا خیال کئے بغیر ـــــ بتائیے آپ سب میں ایسے کتنے لوگ ہیں جنھوں نے یہ کھیل بڑی دلچسپی سے کھیلا ہے؟ ـــــ مسٹر جمال! محل سرا میں ہوتے ہوئے آپ نے تو کئی بار کھیلا ہوگا۔ مسٹر سلیم! دنیا کی دولت لوٹتے ہوئے آپ نے بھی تو بڑی دلچسپی سے ایسے کھیلوں میں حصہ لیا ہوگا۔ مسٹر راجندر! آپ اور آپ کے پتا، سر چھوٹو لال جی تو ملوں کے مزدوروں کی بہو بیٹیوں سے ایسے کھیل لاکھوں بار کھیلے ہونگے؟ ـــــ ارے! آپ سب خاموش کیوں ہیں؟ کیا بندر کا تماشہ نہ دیکھئے گا؟ کیا سوار کے کرتب ... لطف اندوز نہیں ہوئیے گا؟ کہئے! کچھ تو کہئے! آپ کا یہ غلام آپ کے حکم کا منتظر ہے ـــــ" اور نہ جانے میں نے کیا کیا کہا۔ مجھے تو اب صرف اتنا یاد ہے کہ میری باتیں محفل پر بم بن کر برسیں۔ تم سب پر سکتہ کا عالم طاری تھا۔ سب خاموش تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تم سب کے احساسات پر بجلی گر پڑی ہے، جس لبادے سے تمہاری محفل نے، تمہاری سوسائٹی نے، تم سب نے اپنے گندے جسموں کو لپیٹ رکھا تھا، میں نے ایک ہی جھٹکے سے نکال پھینکا۔ آج تم سب ایک دوسرے کے سامنے ننگے تھے۔ اُس ذلیل ماحول میں مجھ سے ٹھہرا نہ گیا۔ میرا دم گھٹنے لگا اور میں وہاں سے چلا آیا۔ اس واقعہ کو آج چھ ماہ ہو گئے ہیں، لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کل رات ہی کی بات ہے۔ اس کے بعد ہم پھر کبھی نہ ملے۔ یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ میں نے خود کو تمہاری ذلیل دنیا سے الگ رکھا۔ تم گھر پہنچے اور بوڑھے والدین پر اپنا غصہ اُتارنے کے بعد تم نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گھر چھوڑ دیا۔ گھر چھوڑتے وقت تم یہ بھول گئے کہ تمہارے والدین کا بھی تم پر کچھ حق ہے۔ اُنھوں نے مصیبتیں جھیل کر، خود کو بُرا بھلا کہلوا کر، اور تمھیں ہمیشہ اچھا کھلا کر اس لئے انسان نہیں بنایا تھا کہ تم انھیں یوں ہی چھوڑ جاؤ۔ انھوں نے تمھیں پالا پوسا، صرف اس امید پر کہ تم ان کے بڑھاپے کا سہارا بنوگے، لیکن تم نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ ان کی آرزوؤں کا گلا گھونٹ دیا۔ صرف ایک عورت کے لئے اپنا گھر، اپنے بھائی، اپنے بوڑھے والدین، سب کچھ چھوڑ دیا۔ مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔ تم لاکھ برے سہی لیکن آخر تم میرے بھائی ہو، تمہاری رگوں میں بھی وہی خون دوڑ رہا ہے جو میری رگوں میں ہے، تم نے بھی اسی ماحول میں پرورش پائی جس میں مَیں نے ہوش سنبھالا۔ پھر آخر یہ کیسا گورکھ دھندا ہے کہ تم ہم سب کو یوں بھولے شادی رچا رہے ہو؟ میری ذات سے تمھیں نفرت ہے، یہ میں ماننے کے لئے تیار ہوں۔ میں ہوں کچھ ایسا ہی۔ دنیا میں آج تک کسی نے بھی مجھے پیار بھری نظروں سے نہیں دیکھا۔ بچپن گھر والوں کی گالیاں سنتے گذرا۔ جوانی اپنے ساتھ ٹھوکریں لائی۔ مستقبل ماضی سے زیادہ سیاہ نظر آتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر تمھیں مجھ سے نفرت ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، لیکن تمہارے بوڑھے ماں باپ نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ ننھی شیریں کا کیا قصور ہے جو تم اسے بھولے اپنا گھر بسا رہے ہو؟ بلقیس تو "بھائی جان، بھائی جان" کی رٹ لگاتی چل بسی۔ اگر تمہارا یہ رویہ صرف میری وجہ سے ہے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے ہوتے ہوئے میں اپنی منحوس صورت تمھیں کبھی نہ دکھلاؤں گا، تمہاری پیار بھری زندگی میں کبھی نہ آؤں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں، اس چیز کی قسم کھا کر کہتا ہوں جو مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے، لیکن للہ گھر لوٹ آؤ، میرے کمزور بازوؤں میں اب اتنی طاقت نہیں کہ گھر والوں کا بوجھ اٹھا سکوں اور پھر مجھے دور بھی تو جانا ہے۔

تمہاری شادی کو اب صرف سولہ گھنٹے رہ گئے ہیں۔ ان سولہ گھنٹوں کے بعد وہ تمہاری ہوگی۔ میں نے شروع ہی سے غلطی کی جو اس کا خیال دل میں لایا۔ صرف ایک لمحے کے لئے میں نے زندگی کو اس کے اصلی روپ میں دیکھا تھا۔ صرف ایک ساعت کے لئے اس نے میری طرف محبت کی نظروں سے دیکھا، اسی ایک مسکراہٹ نے میری زندگی برباد کر دی۔ اسی ایک مسکراہٹ نے مجھے دنیا و مافیہا سے بےخبر کر دیا۔ جب ٹھوکر لگی اور ہوش آیا تو اس وقت کافی دیر ہو چکی تھی، چڑیا کا غلام، غلام ہی تھا اور ملکۂ حسن کسی دوسرے کے پہلو میں جا بسنے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ حسین لمحات مسکراتے ہوئے آئے اور آنکھ بچا کر چلے گئے۔ زندگی کے پُرشہد رشتے میرے لئے ایک سراب سے زیادہ ثابت نہیں ہوئے۔ آج، جب شاہدہ کو اور تمھیں اور میری

گھر والوں کو اور ساری دنیا کو میری شکل سے نفرت ہے، نہ جانے کیوں مجھے اس کا یہ بار بار احساس ہو رہا ہے کہ دنیا میں خوشی کی بنیاد ظاہری نہیں، بلکہ نفسیاتی اور جذباتی ہے، تم شاید یہ سوچ رہے ہو کہ شاہدہ کی محبت نے مجھے خلاسفر بنا دیا ہے۔ لیکن نہیں یہ غلط ہے، شاہدہ کی محبت نے مجھے خلاسفر نہیں بلکہ صحرا نورد بنا دیا ہے۔ اب میرے لئے زندگی کا نیا دور شروع ہو رہا ہے، چڑیا کا غلام اب تمہاری حسین دنیا سے دور چلے جانے کی تیاریاں کر رہا ہے تاکہ اس کی پرچھائی بھی تم سب تک نہ پہنچ سکے، دل بیقرار ہے، روح مضطرب ہے، لیکن پھر بھی میں ظاہری طور پر خاموش ہوں، پتہ نہیں میرے دکھوں کے لاکھوں ساتھی مجھے اپنے اس ازلی سفر کی اجازت بھی دیتے ہیں یا نہیں۔ اگر انھوں نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو شاید ان سب سے بے بغیر روپوش ہو جاؤں۔ انھیں ایک رہنما کی ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ انھیں آسانی کے ساتھ مل جائیگا ہمارے خوش نصیب ملک میں رہنماؤں کی کمی نہیں، لیڈروں کا قحط نہیں اور پھر چڑیا کا غلام تڑپتی انسانیت کے کیا کام آئے گا۔ وہ تو ازلی غلام ہے، وہ جو خود اپنی کشتی نہ کھے سکا بھلا اوروں کی کشتی کیا کھے سکیگا۔ اُسے تو اب ایک ازلی سفر پر جانا ہے۔ اب وقت کم رہ گیا ہے، صرف سولہ گھنٹے۔ اگر زندگی رہی تو پھر ملیں گے، ورنہ سمجھنا کہ دنیا سے ایک آوارہ گرد کم ہو گیا۔ ایک غلام کم ہو گیا، مجھے اب کسی سے شکایت نہیں، شکوہ نہیں، شکوہ ہے اپنی قسمت سے، شکایت ہے اپنے اُس مالک سے جس نے نہ جانے کیوں مجھے انسان بنانے کے بجائے غلام بنایا اور کائنات کے اندھے صدرِ اعظم! میری آنکھوں کا نور چھین لینے میں تجھے آخر کیا ملا؟ میرے ہونٹوں کی مسکراہٹ سلب کرنے سے تجھے آخر کونسی خوشی حاصل ہوئی؟ میری دنیا برباد کر کے تو نے کونسی سلطنت جیت لی؟ لیکن —— میں یہ کس سے پوچھ رہا ہوں، اُس سے، جو غلاموں کی بستی سے دور نہ جانے کہاں منہ چھپائے بیٹھا ہے، یہاں کے بدقسمت انسانوں کے مستقبل سے آنکھیں بند کئے۔ انھیں ایڑیاں رگڑتا چھوڑ کر ——!! کاش تو مجھے صرف ایک بار مل جائے اور میں تجھ سے پوچھ سکوں —— کیا ایک انسان کی نافرمانی کی سزا سارے بنی نوع انسان کو بھگتنی پڑیگی؟ کیا ہمیں بغیر چون و چرا کئے یوں ہی خاموش یہ ازلی قہر برداشت کرنا ہو گا؟ کیا اسی کا نام فرمانبرداری ہے؟ —— اگر یہ فرمانبرداری ہے تو پھر بزدلی کیا ہے؟ کم ہمتی کسے کہتے ہیں؟ بداعمالی کس کا نام ہے؟ احساسات میرے پرانے عقائد سے بغاوت کرتے جا رہے ہیں۔ ہوش و حواس میرا ساتھ چھوڑ رہے ہیں۔ امیدوں کا چراغ ٹمٹما رہا ہے میرے چاروں طرف تاریکی سی پھیلتی جا رہی ہے۔ نہ جانے کیا ہو رہا ہے۔ کیا ہونے والا ہے۔ شاید غلاموں کی دنیا میں انقلاب آ رہا ہے۔ شاید تمہاری دنیا سے ایک قابلِ نفرت انسان جا رہا ہے، ایک آوارہ گرد کم ہو رہا ہے۔ ایک ناکارہ انسان یہاں سے دفع ہو رہا ہے، میرے اردگرد تاریک سائے سے ناچ رہے ہیں۔ آنکھیں خود بخود بند ہو رہی ہیں۔ آہستہ آہستہ۔ آہستہ آہستہ !!!۔

اقبال متین

فوری گرام

وہ پیگرام کو فوری گرام کہا کرتا تھا۔ تو آج اُس کا فوری گرام تھا۔ فوری گرام کی ہر بات کو کوئی نامعلوم احساس اس کے ماضی کو چونکا دیتا تھا، یوں فوری گرام سے ہٹکر وہ ان ساری بھولی بسری باتوں کو کبھی یاد نہ کرتا۔ کیوں یاد کرے آخر، گذشتے تھوڑے ہی زیادہ ہوجاتے ہیں اس بیکار سوچ سے۔ دلالی اور وہ کلبٹ اور عصیم میاں کون نہیں۔ دنیا ہے اس کا قرض۔ لیکن عصیم میاں کے خیال سے اس کے دماغ میں جیسے کنکھجورے کلبلانے لگتے اور وہ تلملا جاتا۔ شریانوں میں جیسے چیونٹیاں دوڑنے لگتیں۔ ہاتھ پاؤں پھولنے لگتے دبیتے ہوئے کئی دنوں کی سرد خاک میں دبا ہوا اس کا ماضی اک ذرا کروٹ سی لینے لگتا ـــــ عصیم میاں اور بانو، وہ تڑپ جاتا۔ سب سے بڑا قرضدار وہی ہی۔ اس کا دوال رواں بھی تو میرا قرض ادا نہیں کر سکتا اور کیسے اکڑا اکڑا پھرتا ہے، جیسے کچھ نہیں بگاڑا میرا۔ خنجر کیوں نہ بھونک دیا میں نے اس کو ـــــ لیکن بانو ـــــ اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے بانو، عصیم میاں کی لاش کے پاس کسی دوسرے عصیم میاں سے کھل کھیل رہی ہے۔ اور وہ جھنجھلا اُٹھتا۔ اونہہ۔ کون خون پلائے عصیم میاں کے لئے اور اب بانو اس کی اپنی تھوڑی ہی رہی ہے۔ اور وہ کسی دبے ہوئے جذبے کے تحت جھلاتا، حرام ہو گئی ری بانو۔ لیکن سو جنم تک بھی میں تجھے حرام نہیں سمجھوں گا ـ ہی ہی ـ چاہے، چاہے تو میری بہن بنے، میری ماں بنے، کچھ بھی بن جائے ـ ہی ہی ـــــ اس کے سارے انتقامی جذبے اس کی آنکھوں کی سرخیوں میں تیرنے لگتے اور اسے یوں محسوس ہوتا کہ اس کے اندر چپکے چپکے کھولنے والا جوالا مکھی ایک دم پھٹ پڑیگا۔ اس کے پرخچے اُڑ جائیں گے اور بانو ہنستی رہیگی۔

جب اس کے اندر کھولتا ہوا جوالا مکھی کچھ سرد پڑ جاتا تو وہ سوچنے لگتا۔ بانو چلی گئی۔ خرچ کم ہوگیا۔ زندگی ہے کس سے بس انھیں گول گول چاندی کے روپیوں سے، کاغذ کے نوٹوں سے ـــــ آج دلالی نے نو روپیہ ادا کر دیئے ہیں اور وہ کلبٹ صرف آٹھ آنہ دیتا ہے، مکھی چوس کہیں کا۔ جگری دوست ہے میرا عصیم میاں بھی جگری دوست تھا۔ اور میری بانو کوئی ایسی ویسی چیز تھوڑی ہی تھی۔ سب چھوڑ چھاڑ کر میرا جگری دوست بانو کو لے اُڑا ـــــ اور اس کے کپکپاتے ہوئے ہاتھ آہستہ آہستہ صندوق کا ڈھکن اُٹھا کر بالکل اس طرح اس میں گھس جاتے جیسے مداری کا ناگ چھبڑی اُٹھاتے ہی پھن گھسیڑ دے چھبڑی میں چلر اور بندی کی میلی چکٹ تھیلیوں میں خود بخود اس کے ہاتھ سب کام انجام دے دیتے، اور وہ یہ سب کچھ اتنا جلد پلک جھپکتے کر دیتا، جیسے دنیا کی ساری نظریں اُس کی ان گندی تھیلیوں میں گھس جائیں گی۔ اس کے دل و دماغ پر یہ تھیلیاں چھا جاتیں ـــــ بانو کا تمتمایا ہوا سرخ چہرہ ان لال لال چکٹ تھیلیوں پر سو بار نثار ہو کر کسی دور دراز کھنڈر میں جا گرتا اور کئی دنوں سے جمی ہوئی خاک کی تہیں پھر فوراً اس پر جم جاتیں ـــــ لیکن جب تاڑی کے تین چار سفید سفید شیشے اس کی بجھی ہوئی سی آنکھوں میں لڑکنے لگتے تو وہ پھر بانو کے قریب ہونے لگتا۔ بانو اور چکٹ تھیلیاں وہ اس سے زیادہ کچھ اور سوچ ہی نہ سکتا تھا۔ کبھی بانو چکٹ تھیلیوں پر چھا جاتی، کبھی چکٹ تھیلیاں بانو پر فتح پا لیتیں ـــــ بانو چکٹ تھیلیوں پر چھا جاتی تو تاڑی کے شیشے اسکی آنکھوں میں زیادہ شدت سے رقصاں ہو جاتے، وہ اپنی بیٹے کی ہی کھاتے جیسی سن بھر وزنی کتاب نکالکر ٹیڑھی ترچھی سطروں میں کچھ ٹٹولتا کہ کہیں فوری گرام سے پہلے ہی وہ تاڑی میں پیسے نہ خرچ کر رہا ہو۔ میلے کچیلے دانت نمودار ہوتے اور وہ گنگنانے لگتا:۔

ہم ہضم ہستی کے صدمے سہہ گئے (خیم ہستی)

تو آج بھی یہی ہونے والا تھا۔ تنخواہ کی پہلی تاریخ تھی۔ اگلے فوری گرام سے آج تک اور ۳۰ دن کی خاک اس کے ماضی پر جم گئی تھی —— آج بھی رات کے گھٹا ٹوپ اندھیارے میں تاڑی کے شیشوں کی مدد سے اور اپنے گرد آلود ماضی کو چلتی پھرتی زندگی کی طرح دیکھنے والا تھا۔ اس کی ہر بات، ہر حرکت یہاں تک کہ ہر سانس، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کسی خاص فوری گرام کے تابع ہے، فوری گرام ہی اس کی زندگی تھا، لیکن تنخواہ کی ہر پہلی تاریخ کو جیسے فوری گرام سے وہ اپنی زندگی کا خراج وصول کیا کرتا ہے۔

—— تو ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو اس کی انگلیاں چلتر اور بندی کی چکٹ ہتھیلیوں میں گھوم کر حساب لگا لیتیں۔ آج اتنے روپیوں کا اضافہ ہوگا۔ اور وہ سوچنے لگتا کہ جب پورے ۲۰۰ روپئے جمع ہو جائیں گے تو وہ کوئی اور بانو کو بیاہ لائیگا۔ فوری گرام چھوڑ دیگا۔ اس لئے کہ وہ فوری گرام سے خائف تھا۔ وہ مجھ سے کہا کرتا —— ابے وہ شاعر کے بچے کیا لکھ رہا ہے ڈبا —— آج یا۔ کا فوری گرام ہوا اور تم بیٹے شعیری (شاعری) کرو۔ اچھا بتا تو ایک بات، یہ تاڑی کے دو شیشے حلق سے اترتے ہی مجھ بانو کیوں زیادہ یاد آنے لگتی ہے —— اور میں مسکرا کر کہتا —— "تم کچھ زیادہ چل جاتے ہو چچا۔ اس لئے —— اور اسی لئے تمھارے برادر بزرگ یعنی چچا غالب عشق کو دماغ کا خلل کہتے ہیں۔ اور وہ گالی جڑ دیتا۔ واہ رے واہ حرامزادے ابے چل جاتے ہیں تو بانو کیوں زیادہ یاد آنے لگتی ہے اور وہ جھولنے لگتا، کپکپاتے ہاتھوں سے تالیاں خود بخود بجنے لگتیں۔

میں وہ بدنصیب ہوں بے وطن
نہیں جس کا کوئی ٹھکانہ ہے

فوری گرام کی ہر رات تاڑی کے دو شیشوں کے بعد ہی اس کی آواز بالکل بدل جاتی۔ ایک ایسا شخص جس نے صبح کو اس کی آواز سنی تھی، فوری گرام کے بعد قطعی اس کی آواز پہچان نہ سکتا۔ جیسے ہزاروں جھینگر چرچرا رہے ہوں۔ وہ کچھ ایسی ہی آواز میں چلا چلا کر گاتا، پاس بیٹھے ہوؤں میں سے جب کوئی اس کے گانے کی تعریف کر دیتا تو اس کے لرزتے ہوئے ہاتھ غیر شعوری طور پر تاڑی کا ایک اور شیشہ اس کے حلق میں انڈیل دیتے اور وہ کچھ زیادہ جھومنے لگتا۔ زیادہ چلا کر گاتا ——

نہیں جس کا کوئی ٹھکانہ ہے

آج بھی اس کا فوری گرام تھا۔ آج بھی اپنے ماضی پر جمی ہوئی گرد کو تاڑی کے شیشوں سے دھونے والا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ہر فوری گرام کی رات کو اس کی ہستی میری آنکھوں کے سامنے بالکل عریاں ہو جاتی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ ہر فوری گرام کی رات کو انسانیت اس کی آنکھوں میں بالکل ننگی ہو جاتی ہے اور وہ میری آنکھوں میں بالکل ننگا ہو جاتا ہے۔ انسانیت اس کے سامنے ننگی ہے، لیکن وہ کچھ نہیں کہتا، اس کی ہستی سب کے سامنے ننگی نہیں ہوتی۔ سب اسے ذلیل کہتے ہیں ——

ایک دن وہ اسی طرح ننگا ہو گیا تھا اور میں نے ایک ہی لمحہ میں اس کا نشہ ہرن کر دیا تھا۔ تاڑی کے شیشے اس کھوکھلے دماغ سے لڑھک کر بانو سمیت کسی کھڈ میں جا گرے تھے، اور وہ تیز تیز لگا ہوں سے خلاؤں میں گھورتا ہوا سو گیا تھا۔ کوئی دھینگا مشتی نہ کی تھی، میں نے اس کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کیا تھا، وہ انسانیت کے منہ پر کوئی طمانچہ نہ لگا سکا تھا۔ تاڑی کے دو شیشوں کے باوجود، وہ خاموش ہو گیا تھا، سہم گیا تھا۔ اس کے جرچرے نغمے اس کے حلق میں اٹک گئے تھے۔

دو سال ہو گئے، عظیم میاں میرا جگری دوست بانو کو لے اڑا —— بانو جس کو میں جان سے چاہتا تھا۔ تم نہیں جان سکتے میرے لئے کتنی تسکین کتنا مزا تھا میری بانو میں۔ تمھارے خاندان میں ایک بھی تو عورت ایسی خوبصورت نہیں —— اور "ایسی چیز" کو وہ عظیم میاں بھگا لے گیا۔ بھگا کر چھین لیا مجھ سے —— مردود کہیں کا —— جگری دوست تھا نا۔ ان کا فلاں —— تو کہتا ہے گالی مت بکوں۔ اچھا تو سے گالی نہیں دیتا حرامی پنے کو —— اور وہ خاموش ہو گیا تھا ——

فوری گرام کی ایک رات وہ پھر نشہ میں دھت ہو کر آیا۔ گلی کے موڑ ہی سے اس کی آوازیں سنائی دینے لگیں —— خاندان کے ہر ہر فرد کو وہ نام بنام گالیاں دیتا۔ گالیاں بکتے بکتے گانے لگتا، گاتے گاتے پھر گالیاں دیتا —— چرچری آواز میں اس نے وہیں سے پکار کر کہا: زندہ گاڑ دوں گا دی ولانی۔ دفن کر دوں گا رانڈ تجھ کو تو۔ اور چوکھٹ تک آتے آتے اس نے تان لگائی

جلسوں ہوں یکسی کے ناسور ہو بغل میں

کہاں ہے رے وہ شُسیر اور اس نے ایک فحش گالی دیدی۔ ابے آتا ہے کہ نہیں۔ "دیکھو بٹیا یار آج ایک "نوا" (نیا) "گانا" (گیت) گاتے ہیں —— بانو ہوتی تو —— تو یار بانو کو بغل میں لے کر یہ گانا گاتے۔ اور تم۔ تم سب ترستے بانو کو دیکھ دیکھ کر —— اور اس نے نصیر کی طرف ایک چھوٹی سی مجلد خوبصورت کاپی بڑھا دی۔ کالی جلد پر سنہری حروف صاف چمک رہے تھے۔ ماضی کے گھٹا ٹوپ اندھیارے میں جیسے اس کا مستقبل آج صاف چمک رہا تھا۔

یہ ایسی کاپی کیسے بنالی چچا —— اور وہ بگڑ گیا۔ کیسے بنوالی۔ جیسے میں بنوا نہیں سکتا —— ارے میری تھیلی سلامت ہے تو میں تجھ جیسی چھین کاپیاں بنوا لوں اور میں مسکرا دیا۔ مجھ جیسی کاپیاں؟ ہاں ہاں تجھ جیسی، تیرے باپ جیسی، کیا سمجھتا ہے مُو کے پچھے —— اور اس نے کاپی کھول کر میری طرف بڑھا دی —— لو بیٹے "نوا" "گانا" (گیت)، پڑھو —— بانو کے لئے "شعیری" (شاعری)، کریں اور آج ہی کاپی میں نہ لکھیں۔ ارے کاپی تو بانو جیسی ہی چاہئے۔ کاپی میں لکھا تھا:

جلسے ہوں یکسی کے معشوق ہو بغل میں

کس سے لکھوایا ہے چچا —— ہم نہیں لکھ سکتے جو کسی سے لکھوائیں —— واہ بیٹا واہ —— واہ واہ وہ چرچرایا۔

جلسوں ہوں یکسی کے ناسور ہو بغل میں

مٹی کے بائل میں بچی کچی دارو کو اپنے حلق میں انڈیل کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ جب وہ بہت پی جاتا تو یونہی کیا کرتا۔ فوراً اُٹھ کھڑا ہوتا اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر پاؤں پٹک پٹک کر تالیاں بجا بجا کر ناچنے لگتا —— بم بتی بم بتی —— تالیوں اور بم بتی میں جب ذرا آہنگ پیدا ہو جاتا تو وہ کچھ اور تیز تیز ناچنے لگتا —— بم بتی بم بتی —— اور گھر کے تمام بچے اس کے اطراف تالیاں بجا بجا کر ناچنے لگتے۔

ناچتا ناچتا جب وہ بے دم ہو کر گر جاتا تو اس کی تیز تیز سانسیں یوں معلوم ہوتیں جیسے نظام کائنات کو درہم برہم کر دینگی جب سانس برابر ہوتی تو وہ پھر اٹھتا —— زبیدہ ادی وہ زبیدہ —— ادھر آ پیاری —— زبیدہ دراتی ہوئی اس کے پہلو میں بیٹھ جاتی اور وہ جھوم جھوم کر گانے لگتا:

جلسوں ہوں یکسی کے ناسور ہو بغل میں

زبیدہ محلہ بھر میں بہت بیسوا مشہور تھی، پڑوس میں قرض دینے والے پٹھانوں سے لیکر گلی میں گلی ڈنڈا کھیلنے والے لونڈے تک اس کے دروازہ کے سامنے جمع رہتے —— عزو چچا کے فوری گرام کی رات جب فحش فحش گالیاں اس کے کانوں میں پہنچتیں تو پاؤں دبا کر ہمارے گھر میں گھس آتی اور عزو چچا کو دیکھ کر کچھ خائف نظر آنے کی کوشش کرتی کچھ جھینپتی کچھ دبکتی جیسے وہ عزو چچا کی گالیاں سنکر نہیں بلکہ چھوٹے کے لئے آگ لینے آئی ہو۔ عزو چچا اس کو دیکھ پاتا تو ایک ہی چھلانگ میں اس تک پہنچ جاتا آ گئی ری میری جان "

ایک دن عزو چچا نشہ میں دھت تھا۔ زبیدہ اس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ چرچرایا۔ ابے وہ شاعر کی اولاد۔ دیکھتا ہے کیسی بیٹھی ہے یہ بے شرم رانڈ مجھ سے تنگ کر —— چاہوں تو۔ حرامزادی کو بچہ —— بھی اب۔ مگر۔ مگر

جیسے کوئی میرا کلیجہ تھنے لگتا ہے (اور اس نے ہاتھوں کے اشارے سے مسوسنے کے انداز کو ظاہر کرتے ہوئے کہا) جیسے میری بانو سامنے کھڑی رونے لگتی ہے۔ بانو میری نہیں ہیں تو بانو ہی کا ہوں اور اس کی تیز نظریں تاریکیوں میں پیوست ہونے لگیں وہ خود سے زبیدہ سے سب سے بے نیاز ہو کر نہ معلوم کہاں پہونچ گیا تھا۔ کھوئی کھوئی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آتے آتے غائب ہو گئی۔ یوں معلوم ہوا جیسے اس کی نظریں ہر رُکاوٹ کو چھید کر آگے نکل رہی ہیں۔ زندگی کو موت کو سب کو گھائل کر رہی ہیں۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ سُلگتے ہوئے آنسو جن میں کائنات کو بھسم کر دینے کی قوت چاہتا ہو۔ ایسے میں زبیدہ اس کی ران میں ہلکی سی چٹکی لے بیٹھی۔ کہاں گم ہو گئے ہو عزّو میاں۔ وہ تمھاری بانو تو سو رہی ہو گی عظیم میاں کی گود میں۔ اور تم ہو کہ......... اور وہ کچھ اس سے بغیر بگڑ گیا۔ کیا بکتی ہے ماں زادی۔ میری بانو کو...... بانو کی بے عزّتی کرتی ہے میرے سامنے۔ گاڑ دوں گا۔ دفن کر دوں گا —————— چلی جا۔ دور ہو جا یہاں سے نکل جا کتّوں کی رنڈی۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ روتا روتا سو گیا۔

دوسری صبح کو وہ اسی طرح معمولاً شرمایا شرمایا، لجایا لجایا سا اٹھا۔ گردن جھکائے ہوئے۔ بالکل گمگھو۔ کولھو کا بیل۔ نوری گرام سے ہٹ کر وہ اپنی زندگی کے بقیہ دنوں میں اسی طرح کولھو کا بیل بنا رہتا۔ کسی سے بات نہ کسی سے ہنسی۔ کمرہ بند کئے ہوئے تکیہ پہلو میں دبائے گھنٹوں کسی کال کوٹھری میں اوندھا پڑا رہتا۔ بچے بھی اس کی ذات سے دلچسپی نہ لیتے۔ کوئی اس کے پاس نہ پھٹکتا۔ نوری گرام کی ہر رات کے بعد دن کو بچے اس کو دروازے کی اوٹ سے جھانک جھانک کر دیکھتے۔ گاگا کر تالی بجا بجا کر ہم تم پچ کر ناچنے والا۔ عزّو چچا بے حس مُردہ کی طرح اوندھا پڑا دکھائی دیتا۔ یا چکٹ ہتھیلی میں انگلیاں گھسیڑ کر کچھ منمناتا رہتا۔ یا موٹی کاپی پر نشتر گاٹے آڑی ترچھی سطروں اور ٹیڑھے بنکے حروف میں کچھ لکھتا ہوا پایا جاتا —— نہ ناچ نہ گانا۔ نہ تاڑی نہ زبیدہ۔ جیسے یہ مُردہ یہ گمگھو کولھو کا بیل وہ عزّو چچا ہی نہیں ہے۔ کوئی اور ہے جس سے سب بچے نا مانوس ہیں۔

عزّو چچا کی ایک بات خاندان بھر میں مشہور تھی۔ رمضان کا مہینہ آتا تو وہ بالکل بدل جاتا۔ گمگھو بیل میں نہ جانے زندگی کی ترنگ کہاں سے آ جاتی۔ سب سے علیحدہ علیحدہ اندھیرے کونوں میں منہ چھپائے رہنے والا اُلّو نہ جانے کس جذبے کے تحت بلبل کی طرح چہکنے لگتا۔ رمضان کی پہلی تاریخ آئی اور عزّو چچا بگلے کی طرح سفید ہو گیا۔ کیڑ کھائی ہوئی ٹرنک کی بوسیدہ شیروانی آنگن میں دھوپ کھانے لگی۔ چاندی کی بنی ہوئی ڈائمنڈ کٹ گھنڈیاں شیروانی پر سجا دی گئیں۔ انگوٹھی انگلی میں مسکرانے لگی۔ مہینوں سے خاموش پڑی ہوئی رسٹ واچ ٹک ٹک کرتی کلائی سے چپک گئی۔ نیا پاجامہ نئی قمیص۔ نئی کھڑاؤں۔ کندھے پر نیا تولیہ..... بات بات پر ہنس رہا ہے۔ بات بات پر دانتیں اچک رہا ہے۔ ذرا چھیڑو بس کھل کر پھول ہو گیا۔ افطار کی تیاریاں ہو رہی ہیں تو "سحری" کی باتیں ہو رہی ہیں۔ تراویح سے لے کر فجر کی نماز تک نہیں چھوٹتی۔ جو گھر میں روزہ دار نہیں اس کو خدا کے عذاب سے ڈرا رہا ہے۔ بس فرشتہ ہی ہو گیا ہے آدمی نہیں، عزّو چچا نہیں۔ بانو کا چاہنے والا نہیں۔ حوروں کا عاشق۔ بات کرو تو بس جنّت کی لے بیٹھے۔ تاڑی کے بدلے عطر میں نہا رہا ہے۔ رمضان میں اس کے گھر کا ہر فرد خوش رہتا۔ پاک صاف عطر میں بسا ہوا۔ نہ پسینہ کی بھبک، نہ تاڑی کی بدبو۔ کنول کی طرح کھل رہا ہے، نکھار رہا ہے، کھلا رہا ہے۔ باتیں میں نرمی۔ چال میں کشش۔ ایک دن آڑے شیو کی وجہ سے دمکتا ہوا چہرہ۔ کسی نے تاڑی کی بات چھیڑ دی اور لگا لاحول پڑھنے۔ میاں اس مبارک مہینہ میں اتنی گندہ باتیں کرتے شرم آنی چاہئے۔ ہم کو ذلیل کرنا چاہتے ہو۔ استاد نہیں۔ ہر شرابی کتّا دوزخ میں نہیں جانے کا۔ اللہ میاں کو کوئی ایک ادا پسند آ جاتی ہے میاں۔ ذلیل سے ذلیل پاس کی رحمت ہو سکتی ہے۔ کیا معلوم —— کیا معلوم ستارہ جیسی ایکٹرس

جنت میں چلی جائے اور میرا سیکل (سہیگل) ایکٹرس دوزخ میں سڑھتا پڑا رہے ـ جپل سینڈھ کھاسئے، پیپ پیئے ـــ
ـــــــ وہ ہمیشہ ایکٹر کو ایکٹرس اور ایکٹریس کو ایکٹرس کہا کرتا تھا ـ

رمضان کی ایک شام تھی، فضاؤں میں دھندہی دھند پھیلی ہوئی تھی ـ پھوار پڑ رہی تھی ـ حدِ نظر تک غمگینیاں ہی غمگینیاں چھائی ہوئی تھیں ـ آج افطار پر خلافِ معمول عزّو چچا نہ تھا ـ سب لوگ متجسس تھے کہ عزّو چچا کہاں غائب ہو گیا ـ دسترخوان پر ہر ایک اسی کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہہ رہا تھا، عزّو چچا رمضان میں کہیں غائب نہ ہوتا تھا ـ آج اس کی غیر حاضری سے سب متشوش تھے ـ سورج غروب ہو گیا پھر بھی وہ نہ آیا ـ پاس کی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی تو مجھے ایسا معلوم دیا جیسے عزّو چچا نشہ میں دھت چرچرا رہا ہے ـ اذان ختم ہوئی تو واقعی موڑ سے عزّو چچا کی مہیب آوازیں آ رہی تھیں، چوکھٹ تک آتے آتے وہ چاروں شانے چت گر پڑا ـ وہ آج تک اتنا از خود رفتہ نہ ہوا تھا ـ سب حیران تھے کہ رمضان میں تاڑی کا نام زبان پر نہ لانے والا کس حالت میں ہے ـ بات بھی بہت اہم ضرور تھی گھر والوں کا چنبہ حق بجانب تھا، عزّو چچا سے کسی کو ایسی امید ہی نہ تھی کہ رمضان کے ماہ میں وہ ایسی حرکت کر بیٹھے گا ـــــ میں ہمیشہ کی طرح اُسے پھر آج پڑھنے لگا تھا ـ آج میں آسانی سے سمجھ نہ سکا ـ نہ منھ پر گالی تھی نہ چہچہاتا ہوا کوئی گیت ـ اس کا تحت الشعور دماغ سے نکل کر آنکھوں کے سامنے آ جما تھا ـ بالکل چپ چاپ سکتے کے عالم میں وہ دھندلکوں کو گھورتا رہا ـ نظریں زیادہ شدّت سے ہر رکاوٹ کو پرے دھکیلتی رہیں ـ میں نے کہا: یہ کیا حرکت کر بیٹھے ہو تم ـ معلوم نہیں کون مہینہ تھا یہ؟ ـــــ وہ تھوڑی دیر چپ بیٹھا رہا ـ پھر اس نے بہت ہی سنجیدگی سے کہا ـ

عصیم میاں نے بانو کو گھر سے نکال دیا ہے ـ بانو بانجھ ہے ـ عصیم میاں کو بچّہ چاہیئے ـ بانو مجھ سے نفرت کرتی ہے، وہ میرے پاس واپس نہیں آنا چاہتی ـ میں ابھی ابھی عصیم میاں سے مل کر آیا ہوں ـ بہت سمجھایا کہ وہ بانو کو واپس بلا لے ـ عصیم میاں نے مجھے جھڑک کر نکال دیا ـــــ وہ پھر گم سم بیٹھا خلاؤں میں گھورنے لگا، گھورتا رہا گھورتا رہا یہاں تک کہ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں، تھرتھراتے ہوئے خشک ہونٹ دانتوں میں دب گئے ـ

میں نے کہا " بھول جاؤ ان باتوں کو عزّو چچا "

اور اس نے خالی خالی آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا " بھول ہی تو رہا ہوں " اور وہ مسکرانے کی کوشش کرنے لگا " سچ کہتا ہے بالکل سچ کہتا ہے شاعر کے لڑے ـ آنسو بہہ جائیں تو آنسو نہیں رہتے ـ یار مرد ہے، مرد تھوڑے ہی روتے ہیں " اور وہ تن کر اٹھ کھڑا ہوا ـ

جب سے صنم ہمارا ہم سے جدا ہوا ہے (صنم)

بم پتی بم پتی ـــــ اور تمام بچّے تالیاں بجا بجا کر اس کے اطراف اس کے ساتھ ناچنے لگے ـ

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے انسانیت ناچ رہی ہے بالکل ننگی بالکل عریاں اور وہ انسانیت کے منہ پر طمانچے لگا رہا ہے، ہاتھ اٹھا اٹھا کر پاؤں پٹک پٹک کر ـ

حامد رشید

تلاطم

یوں ہی سب اسے بھیا بھیا کہا کرتے تھے، نام تو تھا جمیل۔ زیادہ تر نانی کے پاس رہا کرتا تھا۔ والدہ کا انتقال ہوئے عرصہ گذر چکا تھا۔ والد تھے جو اکثر گاؤں دورے پر رہا کرتے تھے۔ کبھی کبھی اسے دیکھنے دو چار روز کے لئے ادھر سے پیتے چلے آتے اور پھر مہینے دو مہینے کے لئے غائب۔ اب تو جو کچھ تھا وہ ہی نانی کا گھر۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں والد کے ساتھ گاؤں کے دورے کیا کرتا۔ دیہاتی زندگی بہت پسند تھی اور پھر خاص طور سے دیہاتوں میں گرمی کا زمانہ بہت اچھا گزر جاتا۔ بہت ہی خوش ہوتا جب گاؤں والے اس کیلئے تازہ تازہ مکھن لاتے اور تعلقدار اپنے ہاتھ سے گیہوں کی موٹی موٹی روٹیاں پکا کر کھلاتا اور جو پھرتا پھراتا شام کے وقت چوپال کی طرف نکل جاتا تو بیٹھے کسان اٹھ کھڑے ہوتے۔ چھوٹے بابو چھوٹے بابو کی صدائیں بلند ہوتیں اور وہ فخریہ انداز سے سب کے درمیان بیٹھ جاتا۔ شہر کے قصے سناتا اونچے اونچے مکان ہوتے ہیں ایسے ٹوٹے چھپروں کو تو کوئی پوچھتا تک نہیں بڑی بڑی شاندار دوکانیں تمہارا بنیا اگر جا دیکھے تو وہیں کا ہو رہے اور ساری کرتوں بھول جائے اور پھر وہ دنیا بھر کے قصے سنانے لگتا۔ جاپان کو ہرا دیا ہے انگریزوں نے۔ بڑے بڑے ٹینکوں سے چڑھائی کی تھی پہاڑ اور زمین سب پر برابر چلتے ہیں ٹینک۔ جاپان کو ہارنا پڑا۔ کوئی دہقان بیچ میں بول اٹھتا۔

"بابو کبھی ہے لڑائی بھی تو ٹھنڈی پڑ گئی اور یہ جپان کون ہے۔ بابو جی" اس وقت اپنے پڑھے لکھے ہونیکا احساس ہوتا۔ آخر آٹھویں جماعت میں تعلیم پا رہا تھا۔

"تمہارے یہاں کوئی اسکول وسکول بھی تو نہیں۔ کیا خاک سمجھاؤں۔ یہ تک نہیں جانتے کہ جاپان کون ہے۔ ہمارے سالانہ جغرافیہ کے پرچے میں تو ایک سوال بھی آیا تھا۔

"مالک جلائے بابو۔ ہم پڑھ لکھ کے کیا کریں گے۔ میرا رامو بڑا ہوئے تو منشی پڑھانا" کوئی کہتا۔ اسی طرح وقت گزرتا چلا جاتا اور وہ پھر نانی کے پاس لوٹ آتا۔ آتے ہی گھبراہٹ محسوس ہونے لگتی.... پھر سے اسکول جانا پڑیگا۔ وہی کتابیں، وہی حساب کے لمبے لمبے سوال گھر میں رہو تو نانی اماں کے پرزور تقاضے "بیٹا اٹھو نماز کا وقت ہو گیا۔ پانی لوٹے میں رکھ آئی ہوں،" اور پھر جب سستی کرتا تو پھر وہی تکرار "اٹھو میاں لاحول پڑھو۔ بھلا کہاں شیطان کے بہکانے میں آئے ہو۔ سناٹے پڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اور بیٹا دیکھو شام ضرور امام صاحب سے کہہ آیو کہ میلاد پڑھ جائیں۔ میں نے منت مانی تھی،" ان کی منتوں نے بھی ناک میں دم کر دیا تھا ذرا گھر آنے میں دیر ہوئی وہ پانچ پیسے کی ریوڑیاں مان لیں "خدا نکرے کہیں موٹر کے نیچے تو نہ آگیا... کہیں کنوئیں میں تو نہ گر گیا" خدا جانے اور کیا کیا سوچتیں۔ کبھی کوئی برا خواب دیکھا تو ڈیڑھ پاؤ گوشت سر پر سے نثار کرکے چیلوں اور کوّں کو ڈالدیا۔ اگر باجی کرتی سے الجھ کر گر پڑیں تو واویلا مچا دی اور جب وہ بخیریت ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں تو جھٹ دو نفل شکرانے کے پڑھ ڈالے۔ بھلا جی چاہے یا نہ چاہے اگر سر ہو گئیں ہیں کہ میاں کچھ کھائے تو لاؤں۔ ارے کوئی قصہ ہی سنا۔ یہ تو کیا پڑھ رہا ہے۔ اور جب کہتا کہ "نانی اماں یہ تو جغرافیہ ہے تمہیں کیا سناؤں" تو وہ جواب دیتیں۔ "ارے سنا بھی رے میاں۔ یہ جغرافی کیا کہانی ہوتی ہے تجھے شوق ہی نہیں ہم بچے تھے تو خوب نبیوں کے قصے پڑھا کرتے دوسروں کو الگ سناتے" اور پھر وہ کتاب بند کرکے سرہانے رکھ لیتا جی چاہتا کہ کپڑے جھاڑ کر کہیں نکل بھاگے۔ نماز پڑھنے کا تو اسے خود ہی شوق تھا۔ مگر نانی اماں نے تو ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اور اب وہ صرف انھیں دکھانے کے لئے نماز پڑھا کرتا جب کبھی

تھوڑے بہت پیسوں کی ضرورت پڑتی تو وہ جھٹ۔ وضو کر نماز پڑھنے کھڑا ہو جاتا اور بقول نانی امّاں کے "اللہ سے بولو گو دیتا ہے" اسے مطلوبہ رقم مل جاتی اس کے بعد وہ اور سعید کسی سینما میں سلے جاتے۔ وہ تو باجی سے دل بہل جایا کرتا ورنہ کبھی اس مکان میں نہ رہتا۔ ساجدہ کو باجی کہا کرتا تھا۔ وہ نانی کے ایک رشتے کے بھائی کی لڑکی تھی جو بچپن ہی سے چل بسے تھے اور اب دنیا میں اس کا سوائے بوڑھی نانی کے کوئی نہ تھا۔ بچپن ہی سے اُن کے پاس رہتی تھی۔ گھر کا کام بھی اُسی کو کرنا پڑتا۔ وقت کے لپکتے ہوئے شعلوں کے ساتھ ساتھ وہ جوانی کی طرف تیزی سے قدم بڑھا رہی تھی اور اب تقریباً انیس بیس سال، کی ہو چکی تھی۔ بچپن میں تو بہت سیدھی سادی زندگی گزاری مگر اب طرح طرح کے شوق پیدا ہوتے جا رہے تھے۔ ادھر بڑی بی نے پریشان کر رکھا تھا۔ جہاں دوپٹہ سر سے سرکا اور انھوں نے ٹوکا۔ کھڑکی سے جھانکا اور ہاتھ پکڑ کے پیچھے کر لیا۔

"بیٹی عورتیں غیر مردوں کو نہیں دیکھا کرتی ہیں" اور پھر ساجدہ رنجیدہ سی اٹھ کر چلی آتی۔ انگریزی کی کتاب پڑھنے کے لئے سخت منع کر دیا گیا تھا لہٰذا جمیل سے کہتی۔

"بھیّا کوئی ناول لا دو نا۔ دل گھبراتا ہے" پھر وہ کوئی اچھا سا ناول یا کسی ناول ——— کا اردو ترجمہ اسکول لائبریری سے نکلوا کر لا دیتا۔ مگر وہ چند دن اور رات پڑھ کر یوں ہی رکھ دیتی۔ اسکول کی سیدھی سادی کتابوں میں اسے کچھ لطف نہ آتا۔ رفتہ رفتہ اسے سینما دیکھنے کا شوق ہوتا جا رہا تھا۔ جمیل کو اچھی طرح یاد تھا کہ ایک مرتبہ تقریباً دو تین سال پہلے اس نے سینما جانے والوں کو بُری طرح کوسا تھا ..... لیکن جب باتوں باتوں میں اس سے کہہ جاتی۔

"بھیّا کبھی ہمیں بھی دکھاؤ نا تمہارا سینما"

اور وہ جواب دیتا "نانی امّاں سے پوچھ لو۔ خدا قسم بڑا اچھا ہوتا ہے۔ ایسی اچھی اچھی عورتیں ناچتی ہیں کہ دیکھنے والے تالیاں بجانے لگتے ہیں۔ چلو گی نا"

"سچ، ننگی مرد تالیاں بجاتے ہیں۔ عورتیں ناچتی ہیں گاتی ہیں۔" اسی خیالی دُھن میں بڑے آئینے کے سامنے چلی جاتی اور گھنٹوں مسکرانے کی کوشش کرتی وہ بھی تو ایک عورت ہے۔ آخر کیوں نہ ناچے اور گائے، "اور کپڑے کیسے پہنتی ہیں سینما کی عورتیں" وہ پوچھتی

"بہت اچھی اچھی ساریاں۔ خوبصورت جمپر۔ بالکل انگریزوں کا سا لباس اور وہ....."

"ہاں ہاں بتاؤ وہ کیا۔ بتاؤ پھر میں بھی دیکھوں گی"

"وہ بہت بڑا لباس پہنتی ہیں باجی۔ اُن کے ہاتھ پاؤں کھلے ہوئے ہوتے ہیں اور پیٹ تو صاف نظر آتا ہے۔ اور اس لباس کو لوگ بہت پسند کرتے ہیں۔ اور وہ عورتیں بہت گوری گوری ہوتی ہیں۔ مردوں سے خوب باتیں کرتی ہیں کبھی وہ انہیں گود میں اُٹھا لیتے ہیں اور کبھی محبت سے پیار کرتے ہیں۔ بڑا اچھا کھیل ہوتا ہے باجی۔ تم دیکھتی تو ہو نہیں۔ یونہی بس پوچھ کر رہ جاتی ہو چلی چلو نا آخر ایک دن"

ساجدہ یہ باتیں سنکر کچھ کھو سی جاتی۔ جمیل کی سنائی ہوئی باتیں تو کچھ عجیب ہی ہوتیں۔ دل چاہتا کہ اُسے بھی کوئی پیار کرے اور خوب چپکائے بالکل سینما کی عورتوں کی طرح اُس نے آخر فیصلہ کر ہی لیا کہ ساری، اور جمپر ضرور پہنا کرے گی۔ کئی مرتبہ نانی سے کہا مگر جانے کیوں وہ اجازت ہی نہیں دیتی تھیں۔ "فرنگی پہنتے ہیں ایسے کپڑے بیٹی۔ ہمیں کیا واسطہ" اور وہ دل مسوس کر رہ جاتی.......

دن گزرتے گئے ساجدہ اکثر چھپ چھپ کر کھڑکی میں بیٹھ جاتی۔ خاص طور سے جب نانی امّاں نماز میں مصروف ہوتیں۔ اب وہ انگریزی وضع کے بال بھی بنانے لگی تھی۔ مہینے پر جب ہاتھ خرچ کے دس روپئے ملتے تو جمیل سے خوشبودار تیل اور عطر کی شیشی منگا کر رکھ لیتی۔ اور جمیل کو اُس وقت بہت ہی حیرت ہوتی جب اپنے اسکول کے لڑکوں کے ساتھ گلی میں سے گزرتا اور باجی جوں کی توں بیٹھی رہتیں دسویں جماعت والے اوپر دیکھتے اور پھر اس کی باجی کھڑکی کا ایک پٹ بند کر لیتیں۔ بیحد مجبور کرنے پر نانی امّاں نے ایک سرخ رنگ کی جمپر اور شلوار بنوا دی تھی جسے وہ روزانہ پہنا کرتی۔ گانے کا بھی شوق ہوتا جا رہا تھا آواز تو ضرور اچھی تھی مگر گانا خاک نہ جانتی تھی گو جمیل نے دو تین دو

گانے گا کر سناتے بھی تھے۔ لیکن وہ کوئی انگریزی ہفتہ وار پرچہ اپنے دوست سے مانگ کر لایا۔ صرف اس کی تصویریں دیکھنے کے لئے جگہ جگہ فلمی اشتہارات دیئے ہوئے تھے ساجدہ انہیں دیکھنے لگی۔

"یہ ستارہ بڑی اچھی ڈانسر ہے" جمیل نے نیم عریاں تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا اور ساجدہ کو ایک پھریری سی آئی جمیل کے جانے کے بعد وہ ہر تصویر کو بڑے غور سے دیکھتی رہی اور نیم عریاں تصویریں تو اُسے بہت ہی پسند تھیں۔ ایک روز نہا کر کپڑے بدل رہی تھی۔ جمیل اچانک کمرے میں داخل ہو گیا واپس لوٹنے ہی والا تھا کہ اُس نے آواز دی۔

"آجاؤ جمیل۔۔"

"لیکن ابھی جمپر تو پہنا ہی نہیں" وہ سوچنے لگا اور ترچھی نظروں سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میں پہلے سے دُبلی تو نہیں معلوم ہوتی" مسکراتے ہوئے جمیل سے مخاطب ہوئی۔۔۔۔۔ "بتاؤ نا جمیل نیچے کیا دیکھ رہے ہو سچ مچ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سے بہت دُبلی ہو گئی ہوں" اور جمیل نے نظر اٹھا کر دیکھا، "کوئی بھی نہیں باجی۔۔۔۔۔ خوب تو موٹی ہو۔ پسلیاں تو میری نکل رہی ہیں۔ لو دیکھو" پھر اُس نے گریبان کے بٹن کھول ڈالے۔۔۔۔ محنت بہت کرنی پڑتی ہے پڑھتیں تو مزہ آجاتا۔ اچھا لاؤ وہ پرچہ تو دیدو یوسف مانگ رہا تھا۔ پھر اس سے ناول لاؤنگا۔۔۔ ساجدہ نے جمپر پہن لیا اور جمیل پرچہ لیکر باہر نکل آیا۔۔۔۔ اور دیکھو جمیل ناول ضرور لانا تمھارے دوست سے۔۔۔۔ وہ چلائی۔۔ حسب معمول وہ سوچنے لگی جمیل بھی تو مرد ہے پھر "مجھے" پسند کیوں نہیں کرتا۔ وہ مجھے دیکھ کر شرما کیوں گیا تھا۔۔۔۔ جوانی ڈھلی جا رہی تھی۔ اور اس پر ہلکا ہلکا سا کیف طاری ہوتا جا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی جوالا مکھی بہت ہی جلد پھٹ پڑنے والا ہو۔ اور اس کے آثار۔۔۔ وہ تو ساجدہ سے نمایاں ہو ہی رہے تھے۔ اسے کسی چیز کی تلاش تھی۔ سکون۔ اضطراب۔ کیف۔۔۔ بے چینی نہیں کچھ بھی نہیں بس تلاش۔۔۔ کسی چیز کی۔۔۔ مگر کہاں؟ یہ بھی تو معلوم نہ تھا۔ کیوں؟ اسکا جواب وہ کیا دیتی

ساون بھادوں آتے اور خوب گرج گرج کر برستے۔ ٹھنڈی ہوائیں چلتیں۔ درخت نیا لباس زیب تن کرتے۔ مگر بیکار۔ بے سود ساجدہ کو ماحول سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اب وہ جمیل سے بہت زیادہ دلچسپی لینے لگی تھی وہ بھی تو نویں جماعت میں آگیا تھا۔ جمیل کو اس قدر مہربانی پر حیرت تھی اور نانی اماں وہ تو وہی تسبیح ہاتھ میں لئے جائے نماز پر بیٹھی بس اللہ اللہ کرتی رہتیں۔ اور بس یونہی دن گذرتے گئے ایک روز وہ سو رہا تھا۔۔۔ "خواب میں دیکھا جیسے فضا میں اُڑا جا رہا ہے۔ اوپر۔۔ بہت اونچائی پر۔۔۔ اُڑتا گیا۔۔۔ اُڑتا ہی گیا اچانک ساجدہ نظر آجاتی ہے۔۔۔۔ وہ گا رہی ہے جھوم جھوم کر۔۔ نیلے آسمان کے نیچے مل رہے ہیں۔۔ جیسے کسی دوشیزہ کی کروٹیں۔۔ وہ بڑھتی چلی آرہی ہے اور اسے دیکھ کر شرما جاتی ہے۔۔۔ وہ خود جیسے عمر میں اس سے کہیں بڑا ہو ساجدہ کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے وہ جھجکی دیکر غائب ہو جاتی ہے۔ وہ پھر بڑھتا ہے ساجدہ کمرے میں کپڑے تبدیل کرتے ہوئے ملتی ہے۔۔ لیکن اس بار وہ شرما جاتی ہے اور بھاگ کر نظروں سے غائب ہو جاتی ہے اور پھر۔۔ سر۔۔۔ ر۔۔۔ ر۔۔ ر۔۔۔ جیسے اب وہ ہوائی جہاز میں اُڑا جا رہا ہے۔۔ پھر ایکدم جیسے کسی نے بہتے پانی کی رو میں دھکا دیدیا ہے۔ گرداب میں پھنس کر چکر لگا رہا ہے۔ اور سانس پھول گئی ہے۔ ساجدہ دور آسمان پر قہقہے لگا رہی ہے۔۔۔ پھر پانی سے نکل پڑتا ہے۔ ساجدہ کا تعاقب کرتا ہے۔ دونوں بھاگتے ہی چلے جاتے ہیں آخر وہ اُسے پکڑ لیتا ہے؟ ساجدہ کہتی ہے "بھیا بھیا۔۔۔ یہ کیا حرکت ہے۔ میں تو تمھاری باجی ہوں۔۔ بھول گئے بڑی ہوں تم سے۔۔" پھر وہ کہتا ہے "تم بہت دُبلی ہو گئیں۔ باجی۔۔ لاؤ دیکھوں تو۔۔۔" "نہیں۔۔ نہیں اور پھر دونوں گتھ جاتے ہیں۔۔ ار۔۔۔ ر۔۔۔ ر" جمیل کی آنکھ کھل گئی۔۔ پلنگ کے نیچے پڑا تھا۔ سانس زور زور سے چل رہی تھی۔۔۔ صبح ہوتے ہی اپنا خواب ساجدہ سے کہدیا۔۔ اور اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اب وہ جمیل سے اور بھی زیادہ دلچسپی لینے لگی۔ سر میں درد ہو یا نہ ہو وہ روزانہ تقریباً جمیل سے سر دبواتی۔۔ ایک روز جب نانی اماں سر میں درد ہونے کی وجہ سے جلد ہی سو گئی تھیں۔ وہ جمیل کے ساتھ سینما دیکھنے چلی گئی۔ سینما تھا بھی قریب جھٹ پہنچ گئے اور وہ تانگے سے اُتر کر زنانے میں

داخل ہو گئی۔ کھیل شروع ہو گیا۔ ساجدہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہی۔ انٹرول میں اس نے بجلی کے قمقموں کی تیز روشنی میں اپنے آپکو چھپانے کی ذرا کوشش نہیں کی پیچھے بیٹھے ہوئے لوگ اُسے دیکھ رہے تھے، اور وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی کھیل ختم ہوتے ہی وہ لوٹ آئے اور چپکے چپکے اپنے بستروں پر دراز ہو گئے۔ دونوں ایک ہی کمرے میں سویا کرتے تھے مگر ساجدہ کی آنکھوں میں نیند کہاں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گلابی کے نشے میں مدہوش ہو۔

جمیل باتیں کر رہا تھا۔

"کیوں باجی آیا پسند"

"ہوں۔ بہت اچھا کھیل تھا۔ گ کیسی بیباک لڑکی تھی اُس خوبصورت سے مرد سے چمٹی جا رہی تھی۔ بھرے مردوں میں"

"واہ باجی تم نے تو کمال کر دیا۔۔۔ وہ تو تصویریں تھیں"

"ہونگی خیر۔۔۔۔" اور پھر وہ نہ جانے کیا سوچنے لگی۔ جمیل سو چکا تھا۔ لیکن وہ جاگ رہی تھی۔۔۔ جاگے جا رہی تھی۔۔۔ نیند نہ جانے کیوں غائب ہو چکی تھی۔ جی چاہتا تھا اسے بھی کوئی یونہی پیار کرے۔ پکڑ کر خوب جھنجوڑے یہاں تک کے غش ہو کر گر جائے۔ ایک معلوم سی چمک آنکھوں میں پیدا ہو چلی۔۔۔۔۔ آنکھیں بند کر لیں۔ ٹن۔۔۔ ٹن۔۔۔ ایک۔ دو تین اور پھر چار بجنے کو آئے جمیل نے کروٹ بدلی

"جاگ رہے ہو جمیل"

"ہوں۔" اور اس نے پھر سے لحاف چہرے پر سرکا لیا۔

"جمیل۔۔۔ سنو تو۔ سردی بہت ہے آج"

"ہو۔۔۔ں۔۔۔ آں"

"ارے اُٹھو بھی۔ کیا سوئے ہی چلے جاؤ گے" ذرا زوردار آواز میں بولی "ہیں باجی کیا ہے" اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"اُٹھو بھی اللہ۔ صبح ہونے والی ہے۔۔ سردی کسقدر ہے آج"

"بہت ہے۔ تمہیں نیند نہیں آ رہی باجی"

"بالکل بھی نہیں رضائی اور لحاف تو نانی امّاں کے کمرے میں رہ گیا۔

"ارے! وہ اُٹھ بیٹھا۔ تو خالی چادر سے کیا ہو گا۔ میرے پاس آ جاؤ نا"

"ایں۔۔۔۔ ہاں سردی بہت ہی بڑھ گئی ہے"

"تو پھر آ جاؤ جھٹ سے۔ ایک منٹ میں گرم ہو جاؤ گی"

ساجدہ کے بدن میں ایک برقی لہر دوڑ گئی۔ اُٹھی اور اس کے پلنگ پر چلی گئی۔

"میرے اللہ ایسی سردی تو کبھی نہ پڑی۔ تم ذرا اُدھر سرکو بھیّا۔۔۔۔ ہاں بس۔ اب اوڑھ لو لحاف" اور جمیل کی سانس تیز ہو گئی "بہت ٹھنڈے ہو رہے ہیں ہاتھ تمھارے" وہ بولا۔

"ہاں ابھی گرم ہو جائیں گے۔۔۔۔" وہ جمیل کے قریب کھسک گئی۔ اور اسکا جسم کانپنے لگا جیسے سردی محسوس ہو رہی ہو۔

"میں تو بالکل سرے پر آ گیا۔ ذرا تو اُدھر سرکو باجی" مگر ساجدہ بھی سی سی کر رہی تھی۔ آج اس کے دانت زیادہ کٹکٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔۔۔ "بھیّا!

"ہوں" وہ بولی

"چمٹ جاؤ مجھ سے۔۔۔ اف بہت ہی سردی ہے۔ بہت گری ہے شاید۔ لیٹی تو ہو باجی۔۔۔ نیند آ رہی ہے اب" اور سے ایسا معلوم ہوا جیسے بھنور میں پھنسکر غوطے لگا رہا ہے "بھیّا۔ کیا کہہ رہی ہوں میں" وہ چپکے چپکے بولی "ہاتھ ڈال لو نا مجھ میں ابھی گرم ہو جائیں گے۔

اور پھر آپ ہی آپ اُس کے ہاتھ جمیل کے گلے میں حمائل ہوگئے۔ ساجدہ خوب گرم ہوکر میٹھی نیند سوئی اور جب آنکھ کھلی تو سورج نکلنے ہی والا تھا۔ نانی اماں پانی گرم کر رہی تھیں۔ آج طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے اُن کی آنکھ بھی دیر سے کھلی تھی۔ جلد جلد پھونس چولہے میں جھونک رہی تھیں کہیں سورج نہ نکل آئے ورنہ نماز قضا ہوجائیگی۔ ہلکا ہلکا دھواں گھر کے سامنے دُکھ پھونس کے سائبان پر منڈلا رہا تھا۔ ایک دوشیزہ کرن پھوٹی اور سورج نکلنا شروع ہوگیا۔ اب نانی اماں قضا کی تیاری کر رہی تھیں جمیل روز آنہ ساجدہ کے پلنگ پر رضائی اور چادر دیکھ کر سوتا۔ کہیں ایسا نہ ہو باجی پھر بھول جائیں اور اسے۔۔۔۔ اپنے پاس جگہ دینا پڑے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی سوچتا کہ باجی کے آنے سے واقعی وہ بہت گرم ہوگیا تھا جیسے لرزتی کمبل ہی کمبل چاروں طرف لپیٹ لئے ہوں۔

اور پھر جب ایک روز وہ مدرسے سے لوٹا تو تلی ایک تانگے سے کچھ سامان اُتار رہے تھے۔۔۔۔ "آ گئے ابّا جان" خوشی خوشی اندر داخل ہوگیا۔ اب کے ابّا جان خدا جانے نانی اماں سے کیا کھسر پھسر باتیں کرتے رہتے۔ اور وہ پن کٹی سے پان نکالکر چباتی رہتیں اور پھر اُس کے ابّا چھڑی سے زمین کریدنے لگتے۔ ایک دفعہ اُس نے باتیں سُننے کی کوشش کی نانی اماں کہہ رہی تھیں "قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں بیٹا۔ اللہ بخشے میری انوری کو ہائے اب اس کے بعد" اور پھر وہ رونے لگیں۔ "میرے تو ایک ہی بچی تھی میاں وہ بھی اللہ کو پیاری ہوگئی۔ اور تکلیف کیوں نہیں ضرور ہوتی ہوگی مرد ذات ہو۔۔۔ ساجدہ بھی تو میری ہی بچی ہے سب گھر سنبھال لیگی"

"مجھے آپ کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی۔ ادھر آپکا بڑھاپا اور ایسے اس قدر کام"

ساجدہ کا اُس کے ابّا سے پردہ ہوگیا۔ جانے کیوں اُسے یہ رشتہ اچھا نہ معلوم ہوا۔ اب وہ تخیل میں ساجدہ کو ایک ماں کی حیثیت سے دیکھتا۔ جو اُسے ہر وقت ڈانٹتی رہتی۔ اور وہ سعادتمند اولاد کی طرح سب کچھ برداشت کرتا۔ جلد ہی ساجدہ کا نکاح ہوگیا۔ وہ بہت ہی خوش نظر آتی تھی۔

سردی پھر سے کراہتی ہوئی آئی جمیل لحاف اوڑھے سونے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ قریب ہی ساجدہ اور ابّا کے پلنگ برابر بچھے ہوئے تھے۔ وہ سوگیا۔۔۔۔ سوتا رہا۔ رات کے دو بج چکے تھے۔ لحاف ڈھلک کر نیچے جا پڑا۔ اور اُسے سردی لگنے لگی۔۔۔۔ نیند ہی کے عالم میں بول اٹھا۔

"سردی۔۔۔۔۔ سردی۔۔۔ اف بہت ہی سردی ہے۔۔۔ میرا لحاف" اور پھر فوراً چونک کر اٹھ بیٹھا۔ کہیں ایسا نہ ساجدہ گرمانے آجائے۔ نظر ساجدہ کے پلنگ پر گئی۔۔۔ رضائی اور لحاف جوں کے توں موجود تھے۔ لیکن وہ خود غائب۔۔۔۔۔ اسکے ابّا جان کو سردی لگ رہی تھی شاید۔۔۔ وہ سوچنے لگا "کیا ہے جمیل نیند میں کچھ بول رہے ہو" ساجدہ کی آواز آئی اور ایک دفعہ پھر سے وہ گھبرا گیا۔۔۔۔ کہیں ابّا کے سامنے آنہ جائیں۔ باجی" جلدی سے گھبرا کر بول اٹھا۔

"گرمی۔۔۔۔ بہت گرمی ہے باجی۔۔۔۔ تھوڑا پانی۔۔۔۔۔۔"

"ابھی رہنے بھی دو کہاں جاتی پھروگی۔۔۔۔۔۔ سردی میں اور پانی" اس کے ابّا کہہ رہے تھے۔۔۔۔۔۔۔

تینوں کے دلوں میں ایک تلاطم برپا تھا!

تصحیح! کلکتہ کے ناخوشگوار حالات کی بناء پر آسان معمہ نمبر ۳ کلکتہ مطبوعہ افکار ماہ اپریل ۱۹۴۷ء کی تاریخ داخلہ بجائے ۳۰ اپریل ۱۹۴۷ء کے ۷ مئی ۱۹۴۷ء اور تاریخ اشاعت صحیح حل و نتیجہ بجائے ۱۰ مئی ۱۹۴۷ء کے ۲۴ مئی ۱۹۴۷ء مقرر کی گئی ہے۔ قارئین کرام نوٹ فرمالیں۔ ناظم آسان معمہ نمبر ۳، ۸۲ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ

نشاط مظفر پوری

دھرتی کے لال

سکون آباد کی گلیوں اور کوچوں میں بڑی بے دردی اور سفاکی سے حیات و ممات کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ زمین کا کوئی گوشہ اور قطعہ ایسا باقی نہ رہا تھا جس پر آج کے مہذب انسانوں نے آثار قدیمہ کی جان لیوا اور خبیث روحوں کی طرح کشت و خون کا ہنگامہ نہ برپا کر رکھا ہو۔ ہر طرف چیخ پکار اور ہاہاکار۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ظالم موت نے اپنے سنگین اور قباحت انگیز قلعہ کا دروازہ کھول دیا ہے اور حیات بے بسی اور مجبوری کی عمیق خندق میں گری جا رہی ہے!۔

"ماں" دور بہت دور سے آریو کی دردناک آواز ہوا میں گونجتی ہوئی سنائی دی۔

اس خونریزی، تباہی اور بربادی کے منحوس سمے میں تاریکی بھی بھیانک اور وحشت آلود ہوتی جا رہی تھی، جوں جوں ظلمتکدہ میں آہ و فغاں کی جگر خراش آوازیں بگولے کی طرح بلند ہو جاتی تھیں۔ اندھیرے کا ہیبتناک اور مکروہ چہرہ ویسے ویسے نمودار ہوتا جا رہا تھا۔ ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے زمانہ کے تہہ خانوں، جنگل کی خندقوں اور پہاڑ کے غاروں میں چھپی ہوئی تمام تاریکیاں آج کے اندھیرے میں سما گئی ہیں۔ نگاہیں جدھر اٹھتی تھیں بس چند سیاہ لباس میں ملبوس رینگتی ہوئی جان پڑتی اور اس کے منحوس سائے سے دل و دماغ پر خوف کی دبیز کائیاں جم جاتیں۔

"ماں" عربو کی پکار فضا میں تھرتھرائی۔

سکون آباد پر آسمانی قہر و جلال بھی نازل ہو رہا تھا، بادل رہ رہ کر دیوانے سانڈ کی طرح گرج رہے تھے، بجلیاں پل پل میں اگنی دیوی کی مانند چمک اٹھتی تھیں، بارش اور اولوں کی بے پناہ چوٹیں "سرخ زمینوں" پر یوں پڑ رہی تھیں گویا کسی خطرناک اور گناہگار مجرم پر دُرّوں کی بوچھاڑ ہو رہی ہو۔ زمینوں کے وہ حصے جو اب تک خون کی رنگت سے بچے ہوئے تھے، اب وہ بھی پانی اور خون کی مشترکہ سازش سے ناپاکی کے کثیف قطعہ میں شامل ہو گئے تھے۔ الغرض بادل کی گرج، بجلی کی چمک، اور اولوں کے تھپیڑے سکون آباد کی ویرانی اور نیستی و نابودی میں اسی طرح پیش پیش تھے جس طرح سیلاب کی خوفناک لہریں ہمیشہ اپنے پیچھے تخریب کی بیشمار نشانیاں چھوڑتی جاتی ہیں!۔

"ماں!" عربو کی آواز (دور بہت دور سے)، پھر فضا میں یوں تڑپ اٹھی جیسے کوئی درد و کرب سے "شیون و فریاد" کر رہا ہو۔

"ماں!" آریو نے دوسرے کنارے سے اضطرابی لہجہ میں پکارا۔

اس وقت سکون آباد کے اصلی محافظ بھی خاموش تھے، ان کے وہ آدمی بھی خواب خرگوش کے مزے ۔۔۔ رہے تھے جو لوگوں کی اونچ نیچ کی خبر گیری کے لئے ہر وقت مستعد رہتے تھے اور جو اپنے دست بے رحم بڑھا بڑھا کر قانون کی آڑ میں غریبوں اور بیکسوں کا خون چوسا کرتے تھے۔ ان کی اس بے خبری سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سب خود اس وقت وحشت اور بربریت کے بانی تھے اور وہ دل یہی چاہتے تھے کہ زمانہ کے لئے ایک بار پھر "سکون آباد" سکون آباد نہ رہے بلکہ اس میں بغض، حسد اور باہمی کشت و خون کا بازار گرم ہو جائے!۔

"ماں! ماں!!" عربو کی آواز تھی۔

"ماں!" آریو نے للکارا "تو دغا ہمیں چھوڑ کر نہ جا"

"جب! ہمیں ایک بار پھر معاف کردے۔ ماں.......!!" عربو نے بلند آہنگ آواز سے کہا جس میں التجا اور عاجزی کے بے پایاں "جذبات" پنہاں تھے۔

لیکن ماں تھی جو کشت و خون کی آبادی سے دور ہوتی جا رہی تھی، وہ آبادی سے ڈیڑھ میل دور ———— اندھیری گھاٹیوں میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی ہوئی آگے کی طرف لپکی جا رہی تھی۔ بارش کی بے پناہ بوندوں، اور بادلوں کے ضرب انگیز تھپیڑوں کی سے اسے ذرہ برابر بھی پروا نہ تھی۔ آج اس کی راہ میں بڑی بڑی چٹانیں کیوں نہ آکر کھڑی ہو جائیں طوفان کی بلائیں کیوں نہ اس کے گرد و نواح پر گدھ کی طرح منڈلائیں اور وہ اپنی منزل تک پہنچتے پہنچتے فنا کی گود میں کیوں نہ سو جائے، لیکن وہ بھولے سے وحشی اور جنگلی انسانوں کے "خونی ماحول" پر نگاہ نہ ڈالے گی، وہ بڑھتی ہی جائیگی اس کے دل و دماغ کے چشموں میں جہاں اس کی گھٹی ہوئی فضاؤں" میں رہنے کے باوجود ہر وقت محبت اور پیار کی "شاب آمیز نہریں" اٹھتی تھیں، وہاں اب نفرت اور غصے کی امواج ناگن کی طرح بل کھا رہی تھیں، جہاں وہ سکون آباد کے بے بس اور معصوم انسانوں کے حال زار پر آٹھ آٹھ پہر آنسو بہایا کرتی تھی، پر اب وہ انھیں کوستی ہوئی چھوڑ رہی تھی جہاں وہ انھیں "گھٹی ہوئی فضاؤں سے نجات دلانے کے لئے ہر دم انکار و تردد میں مبتلا رہا کرتی تھی، اُسے اب یہ فکر دامنگیر تھی کہ جس قدر جلد ہو ان معصوم صفت وحشی انسانوں کی آبادی سے دور بہت دور ہو جاؤں!۔

"ماں! تو نہ جا، ہمیں چھوڑ کر نہ جا"

"ماں! تجھے خدا کا واسطہ، تو نہ جا، ہمیں چھوڑ کر نہ جا......"

پر ماں نے اپنے دونوں کان بند کر لئے تھے، وہ اب کچھ نہیں سننا چاہتی تھی۔ پہلے سے اس کے اقدام میں اور زیادہ تیز روی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ پانی میں بالکل شرابور تھی، اسے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنی بستی سے بھی بے زار اور عاجز ہے ———— ابھی بادلوں کی بوچھاڑ اور بارش کی سخت چوٹیں ختم ہو گئی تھیں، لیکن تاریکی بدستور سانپ کی کی طرح پھنکار رہی تھی، اس اندھیرے میں وہ کئی جگہ ٹھوکریں کھا چکی تھی اور کئی کئی جگہ گرتے گرتے بچی تھی۔

وہ "سر فلک پہاڑ" کے دامن سے چند قدم کی دوری پر تھی کہ اس کے کان کے پردوں سے یک وقت تین مختلف آوازیں ٹکرائیں، اس کے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ اس کے دماغ میں تار عنکبوت کی طرح لرزش پیدا ہو گئی اور اس کے بڑھتے اقدام یوں لڑکھڑانے لگے جیسے کوئی شرابی نالی میں گرنے کے بعد اٹھ کر چلنے کی کوشش کر رہا ہو لیکن اس نے اپنے دل کو مضبوط کیا، اور حواس کو ٹھکانہ پر لائی اور پھر چلنے لگی۔

"سر فلک پہاڑ" کا سلسلہ پچھم سے لیکر پورب میں بہت دور تک چلا گیا۔ اس کا کچھ حصہ برف کے تودوں سے ہمیشہ ڈھکا رہتا تھا اور اس تودے کو دور سے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے چاروں طرف سبزیاں اور درمیان میں روئی کا ڈھیر ہو، لیکن آج کی گھٹا ٹوپ اندھیری رات میں اس کا تمام حصہ سیاہ معلوم ہو رہا تھا، ماں کی نگاہیں بار بار اٹھتی تھیں مگر اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یا تو وہ اندھی ہو گئی ہے یا نہیں تو وہ برفانی تودے کالی چٹان کی بھیانک صورت اختیار کر چکے ہیں۔ اور ان چٹانوں میں ایسی ایسی دہشت ناک دراڑیں ہو گئی ہیں جنھیں دیکھنے سے ایسا نظر آتا تھا جیسے مگرمچھ اپنا خوفناک چہرہ کھولے ہوئے ہے۔

"ماں!......"

ماں نے بہت ہی نزدیک سے آواز سنی اور یکایک چونک کر یوں رک گئی جیسے کسی نے اس کے دونوں پاؤں پکڑ لئے ہیں اور وہ اندھیرے میں چاروں طرف حیران نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

"آہ! میں مرا...... ماں!" کسی قدر دھماکے کے ساتھ کوئی چلایا۔

ماں فوراً اُس طرف گھوم کر دو قدم آگے دوڑی اور بہت غور کرنے پر دیکھا کوئی اس کے پاؤں کے قریب بیہوش پڑا ہے۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا، نہ جانے کون دُکھ کا مارا ہے، وہ جلدی سے گھٹنے کے بل اس کے قریب بیٹھ گئی اور اسے سیدھا کر کے اس کی ناک چند منٹ تک پکڑے رہی، جب ناک سے سانس کی آمد و رفت بند ہو گئی تو اس کا منھ ایکا ایک کھُل گیا۔

ماں نے اپنی اُنگلیاں ڈھیلی کر دیں اور شدرو نے زور سے سانس لیا اور کہا! "ماں.....!"

"کون......؟" ماں حیرت سے اسے ٹٹولنے لگی۔

"کون — ماں اماں!" شدرو ماں کی آواز پہچانتے ہوئے اس کے پاؤں سے لپٹ گیا۔

"آہ! تو ہے شدرو، تو ہی آوازیں لگا رہا تھا؟"

"ہاں ماں! اور......؟"

"اور؟" ماں کے دل و دماغ میں انجن کے دھوئیں کی طرح خیالات پھک پھک کرنے لگے۔

"کہیں عربو اور آریو بھی تمہاری تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں"

"عربو اور آریو؟" ماں نے متعجب ہوتے ہوئے کہا "نہیں نہیں، وہ اب مجھے واپس نہیں لیجا سکتے، میں اب نہیں جاؤنگی، میں ان سے نفرت کرتی ہوں، وہ میرے بیٹے نہیں ہیں مجھے جلنے دے مجھے جانے دے۔ میں انھیں دیکھنا نہیں چاہتی.........." ماں اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"شدرو جو اب اچھی طرح ہوش میں آ چکا تھا سنبھل کر اُٹھ بیٹھا اور ماں کے دونوں پاؤں پکڑ لیے یوں کہنے لگا، جیسے کوئی فریادی دیوتا کے چرنوں کو تھام کر دل کی انتہائی گہرائی سے التجائیں کر رہا ہو" ماں! ہمیں معاف کر دے۔ ہمیں چھوڑ کر نہ جا......"

"شدرو!" ماں کے ارادے میں لرزش ہونے لگی۔

"ہاں ماں! دریا کے بے پناہ سینہ میں اور سمندر کی اتھاہ چھاتی میں ایسی ایسی لہریں اُٹھتی ہیں اور ایسے ایسے طوفان برپا ہوتے ہیں کہ اگر اس سمے ارجن اپنی انتہا دانشمندی سے بھی کسی مخصوص جگہ کو تیر کا نشانہ بنانا چاہے تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اور اس وقت دریا اور سمندر کے شش جہات میں موت ننگی ہو کر یوں ناچنے اور قہقہے لگانے لگتی ہے جیسے ڈائن دسہرہ کی زمانہ میں سنسان اور ویران فضا کی "روش" پر اپنی ہولناک حیوانیت کا برہنہ مظاہرہ کرتی ہے۔ لیکن ماں! ایسے خطرناک اوقات میں کشتی کا کھویّا پتوار نہیں چھوڑتا اور جہاز کا ناخدا اپنی "ناخدائی" سے دور نہیں بھاگتا۔ پر ماں! میری ماں!! تو ہمیں چھوڑ کر جا رہی ہے، جبکہ تیرا درجہ کشتی کے کھویّا اور جہاز کے ناخدا سے کہیں اعلیٰ و ارفع ہے.........!"

"شدرو!" ماں کے ارادے میں یوں تھرتھراہٹ پیدا ہونے لگی جیسے کوئی فقیر اور یتیم بچہ ابتدائی جنوری کے جاڑے میں فٹ پاتھ پر پڑا کپکپا رہا ہو!۔

"ماں! میں بارش اور ہواؤں کی چوٹوں کو اپنے "غلام بدن" پر سہتے ہوئے یہی سوچتا ہوا، تیری تلاش کر رہا تھا کہ آج میں برسوں کے پوشیدہ اور الم انگیز راز، ماں کے سامنے کھولدوں گا........ لیکن اسے اس دیش سے جانے نہ دوں گا........"

"ماں!" دور سے عربو کی للکار سنائی دی۔

"دیکھو، دیکھو ماں!" شدرو جیسے ایکا ایکی تاریکی کی موجودگی اور بھیگی ہوئی سنسان فضا سے پرے ہو کر روشنی کے گہوارہ میں کہہ رہا ہو "کوئی تمھیں پکار رہا ہے، سن رہی ہو ماں، سن رہی ہو، کوئی تمھیں آوازیں دے رہا ہے۔ اس کی پکار میں

کسی نوجوان اور شوہر پرست بیوہ کی روح جھلک رہی ہے، اس کے آواز سے یعقوب کے پیار جیسا پیار نمایاں ہے ——— وہ کہہ رہا ہے، ماں تو مت جا، ماں مت جا، ہم تباہ و برباد ہو جائیں گے، ہماری تہذیب و تمدن مٹ جائیگا، ہمارے آبا و اجداد کی شاندار یادگاریں تہہ خاک ہو جائیں گی۔ آئندہ اولادو ہمیں بُرے ناموں سے یاد کریگی۔ تاریخ میں " ہماری صورت " بھونڈی اور بدشکل ہو جائیگی اور ہمارے کئے ہوئے "اموز" پر پانی پھر جائیگا......ماں سن رہی ہو؟ نہیں سن رہی ہو، اف! نہیں سُن رہی ہو، سنو سنو ماں!" اور وہ ماں کے پیروں کو یوں جھنجوڑنے لگا جیسے کسی کو جگایا جارہا ہو، لیکن ماں بت کی طرح ہنوز کھڑی تھی، اسے آگے پیچھے اب کچھ نہیں سجھائی دیتا تھا، بس وہ صرف سامنے تاریکی کے خلا میں چپ چاپ تکے جارہی تھی تکے جارہی تھی!۔

"ماں!" وہ پھر گویا ہوا "میں تو تیرا اپنا لڑکا ہوں، میں نے تو تیری آغوش شفقت میں پرورش پائی ہے، میں تو وہی "شدرو" ہوں جس نے تیری لاج رکھنے کے لئے کبھی پتھر کے اوزار استعمال کئے اور کبھی لوہے کے ہتھیاروں سے دشمنوں کا مقابلہ کیا، وہ سب.............!"

"شدرو!" ماں کے سینہ میں جذبات روئے لگے "اب زیادہ نہ کہو، اب زیادہ نہ کہو، میرے زخمی دل و دماغ کو زیادہ پریشان نہ کرو......"

لیکن وہ بہرہ ہو گیا تھا، کچھ نہ سن سکا۔ اس کا " رجحان تخاطب " باتوں کے دھارے میں اس طرح بہتا جارہا تھا جیسے کسی چشمے کا بند ٹوٹ گیا ہو، وہ کہہ رہا تھا " آریو اور عربو تو بہت پیچھے آئے، وہ تو تیری بہنوں کے بیٹے ہیں، مگر میں، میں تو تیرا اپنا لخت جگر ہوں، میرا قصور کیا:..........؟"

"ماں!" دور سے آریو کی دردناک پکار سنائی دی۔

"سنو سنو ماں! آریو تمھیں آواز دے رہا ہے۔ اس کی آواز میں کس قدر ندامت ہے اور شرمندگی کا کتنا شدید احساس جھلک رہا ہے، معاف کردو ماں، اس ظالم کو معاف کردو۔ آج وہ تمھاری معافی کا حقدار ہے......"

"شدرو......!"

"جانتا ہوں ماں! تو اس کا نام سننا نہیں چاہتی اس نے اس دیش میں قدم رکھتے ہی تیرے بیٹے پر طرح طرح کے ظلم و ستم ڈھائے اور اپنی " اونی تہذیبی و تمدنی خوبیوں " کے بل پر اسے اتنا نیچا بنا دیا کہ وہ تاہنوز زندگی کی پر پیچ اور ناہموار راہوں پر بھٹکتا ہوا چل رہا ہے، کتنی نفرت انگیز حرکت تھی اس کی، مگر اس کے باوجود تو نے اسے اپنی گود میں جگہ دی۔ کیوں ہی؟ یہ ایک راز ہے جسے تو کسی دوسرے پر افشا نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن ماں، میرا خیال ہے آج اسی راز کی پوشیدگی سے تیرا بیٹا کہیں سڑکوں پر کانپتا ہوا، جھاڑو دیتا دکھائی دیتا ہے، تو کہیں گندگی کو اپنے سر پر اٹھائے نظر آتا ہے، کہیں بھوک سے کتوں کی طرح ایڑیاں رگڑ رہا ہے تو کہیں پیاس سے زبان نکلے ہوئے ہے........"

"شدرو! مجھے مار ڈال پر زیادہ نہ کہہ۔ میرا کلیجہ چھلنی ہو رہا ہے!"

"ماں!" چالیس قدم کی دوری سے عربو کی آواز آئی۔

"عربو، عربو!! ماں سن رہی ہو، یہ عربو کی پکار ہے، وہ نزدیک آگیا ہے......."

"شدرو! مجھے اب جانے دے...... میں برداشت نہیں کر سکتی ......" ماں جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔

"اے ماں!" وہ بے تاب ہو کر بولا "کیا تو عربو سے بھی اتنی ہی نفرت کرتی ہے، نہیں نہیں۔ اس سے نفرت نہ کر، وہ خود اقلیت کے کثیف گھروندے میں سانس لے رہا ہے، وہ برسوں سے اکثریت کی چکی میں پستا ہوا آرہا ہے

وہ اتنا قصوروار نہیں۔ میں جانتا ہوں ماں۔ میں جانتا ہوں، کیونکہ میں دونوں کی برابر خدمت کرتا ہوں اور دوران خدمت میں کون مجھ سے کیسا برتاؤ کرتا ہے، تو بھی واقف ہوگی۔ پھر......؟"

"ماں! ــــ ماں!!؟ بیک وقت عرلو اور آریو کی آواز ایک دوسرے سے متصادم ہوتی ہوئی فضا میں گم ہو گئی

"سنو! سنو ماں!! دونوں نزدیک تر ہو رہے ہیں۔ دونوں کی پکار ندامت اور "تیری بندگی" سے پُر ہے......"

وہ بدستور اپنے خیال کی رو میں بہتا ہوا کہے جا رہا تھا۔

"شدرو......!" ماں کے انگ انگ میں ارتعاش سا پیدا ہوا۔

"وہ خونی سہی، مگر پھر بھی تیری بہنوں کے بیٹے ہیں۔ وہ ظالم سہی، لیکن باوجود اس کے وہ انسان ہیں، وہ مدتوں سے تیری گود میں پروان چڑھتے آرہے ہیں۔ انھیں چھوڑ کر نہ جا۔ ماں انھیں چھوڑ کر نہ جا، ورنہ ماں! ان کے دلوں میں ہمیشہ کی خاطر نفرت کے شیطانی جذبے پنہاں رہیں گے اور آئے دن ان کے کاروان حیات میں شورش و پیکار کے شعلے بھڑکتے جائیں گے اس لئے انھیں چھوڑ کر نہ جا ــــ ماں مجھے دیکھ۔ میری حالت کو دیکھ۔ میری باتوں کو سُن۔ میں کیا کہہ رہا ہوں اور کن کے لئے تجھ سے ہمدردی اور محبت کی بھیک مانگ رہا ہوں۔ کیا میری روزمرہ کی مصیبت اور "غلام بدن" کو مدنظر رکھتے ہوئے میرا یہی تقاضا تھا۔ نہیں نہیں۔ لیکن کیا کروں۔ آخر وہ میرے بھائی ٹھہرے۔ برسوں سے ان کی خدمت کرتا آیا ہوں۔ انھیں کیسے چھوڑ دوں ــــ کیا ہوا اگر وہ "اونچا" رہیں گے۔ کیا ہوا اگر تیرے بیٹے کو شدرو سے پھر "اچھوتی" نام سے موسوم کریں اس سے میں نیچ نہیں ہو جاؤں گا ــــ مجھے کیا پروا اگر میرے لئے ان کی عبادت گاہوں کا دروازہ بند رہیگا۔ میں خود وہاں جانا نہیں چاہتا۔ بھگوان کی پرستش اور رب کریم کی پوجا کے لئے میری کٹیا پاک اور پوتر ہے۔ ماں سن رہی ہو! میری جھونپڑی، جہاں عشرت قہقہے لگاتی ہے اور عسرت آنسو بہاتی ہے، ان کی عبادت گاہوں سے لاکھ گنا متبرک اور "بلند و بالا" ہے۔ ان کی عبادت گاہوں میں...... جانتی ہو ماں کیا ہوتا ہے......... اف! ماں میں کیا کہنے چلا تھا۔ نہیں نہیں میں نہیں کہوں گا۔ آسمان کے پائے سیماب کی طرح لرزنے لگیں گے، دھرتی کے سینے میں دھماکے ہو جائیں گے اور آتش فشاں پہاڑ جھلستے ہوئے انگارے اور لاوے اُگلنے لگے گا......"

"ماں!"

"ماں!!"

دونوں آوازیں لمحہ بہ لمحہ نزدیک آرہی تھیں جیسے پانی کے پتلے پتلے دھارے چشمے سے مل رہے ہوں اور ان سے ہم آغوش ہونے کے لئے بیقرار ہو رہے ہوں۔

"میں سمجھ رہا ہوں ماں، تو کہاں جانا چاہتی ہے اور کہاں تیری منزل مقصود ہے۔ ہاں "اس سرِ فلک پہاڑ" کی چوٹی پر جائیگی، جہاں سے خدا کے حضور میں ہاتھ اٹھا کر دعائیں مانگے گی۔ کیا دعائیں مانگے گی، میں جانتا ہوں، لیکن ماں! تیرے ہاتھوں میں تو ہزاروں برس سے غلامی کی زنجیریں پڑی ہوئی ہیں، کیا انھیں توڑ پھینکنے سے پہلے بھگوان کے دربار میں بے وارث کی طرح گڑگڑائے گی، وہ بھی اپنی بہبودی کے لئے.........؟"

"شدرو! میں کہہ رہی ہوں چپ رہ" ماں بے چین ہو کر بولی۔

"نہیں کبھی نہیں، ہم تجھے وہاں تک پہنچنے نہ دینگے" وہ ایک سرکش بیٹے کی طرح بلند آہنگ آواز میں بولا ــــ "ورنہ بھگوان ہماری پیشانی پر پھر صدیوں کے لئے ایک نیا داغ ثبت کر دیگا ــــ اور طوفان گزرا کے لئے پھر راہ ہموار ہو جائیگی ہم دنوں کے بعد اس سکت شکن ماحول سے نکلنے کی جان توڑ کوشش کر رہے ہیں!"

(بقیہ صفحہ ۵۵ پر)

جائزے

اردو رسائل پر ایک نظر

ادب اور سیاست

ادب زندگی کی تخلیق کرتا ہے اور زندگی ادب کی خالق ہے!

محمود حسین

اردو رسائل پر ایک نظر

گذشتہ پندرہ سال سے سوائے اُن ماہناموں کے جن کا میں مستقل خریدار ہوں، اردو کا تقریباً ہر رسالہ ہر ماہ خریدتا ہوں اور ہر ماہ عہد کرتا ہوں کہ آئندہ نہیں خریدوں گا۔ پھر خیال آجاتا ہے کہ شاید کوئی نئی بات ہو۔ کوئی جدّت ہو کوئی ترقی نظر آئے۔ اس طرح یہ سلسلہ آج تک جاری ہے کہ میں رسالہ خریدتا ہوں اور پچھتاتا ہوں۔ اُس آدمی کی مایوسی کا اندازہ کیجئے جو ہر مرتبہ نخلستان تلاش کرتا ہے لیکن ریگستان پاتا ہے۔ شادابی اور تسکین غش پاؤں مانگتا ہے لیکن جھلسنے والی دھوپ اور کانٹے اُسے ملتے ہیں۔ کچھ یہی حال میرا بھی ہے

ابتک جو ترقی میں نے محسوس کی ہے وہ تعداد اور نام کی ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اگر پہلے ایک رسالہ شائع ہوتا تھا تو اب تین شائع ہوتے ہیں اور اگر تعداد ہی ترقی کا معیار ہے تو بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو رسائل نے کافی ترقی کی ہے۔ ناموں کی دلکشی جاذبِ توجہ ضرور ہے۔ اگر پہلے فقہ قسم کے نام تھے تو اب گلستاں بوستاں بلکہ جانستان بڑے بڑے حروف میں مختلف پیکر لئے ہوئے منظرِ عام پر نظر آتے ہیں۔ بعض ناموں کو دیکھکر تو پازیب کی جھنکار سستی قسم کی رقّاصہ یاد آجاتی ہے جس کے لباس کی بھڑک اور غازہ کا نکھار دلفریب ضرور ہوتا ہے لیکن حقیقت دلخراش ثابت ہوتی ہے۔ یہ ظاہری دلکشی بھی معدودے چند کا امتیاز ہے۔ ورنہ اکثر سرورق بھونڈے مذاق اور اکثر صفحات لکھائی چھپائی کا ایسا بُرا نمونہ پیش کرتے ہیں کہ طبیعت جھنجلا اٹھتی ہے۔

اس وقت کم و بیش اردو کے بیس ماہانہ رسائل میرے سامنے ہیں۔ جن میں ماہنامہ بھی ہیں سالنامے بھی۔ خاص نمبر بھی ہیں اور عام بھی ہیں تقریباً سب کو پڑھ چکا ہوں۔ جہاں سنجیدگی کی ضرورت تھی میں نے اس نقطہ نظر سے مطالعہ کیا اور جہاں اس کی ضرورت نہ تھی اس کا تذکرہ ہی بے سود ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اِن رسائل کا مقصد ادب، فن یا سماج کی خدمت نہیں بلکہ صرف ذاتی منفعت ہے اور جنگ کی وجہ سے جو ذہنی اور تمدنی انقلاب ہوئے ان رسائل نے اِن سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے نفع کمانا بھی کوئی بُرا مقصد نہیں بشرطیکہ اس کے ساتھ ادب کے حقیقی مقصد کی طرف بھی توجہ ہوتی رہے۔

لکھائی چھپائی کے نقائص۔ مضامین کا ژولیدہ پن۔ افسانوں کے گرے ہوئے معیار، نظموں یا غزلوں کو چھوڑ کر پہلے یہ دیکھئے کہ ایک ماہنامہ کن اجزا سے مرکب ہوتا ہے۔ ایک فرضی رسالہ لے لیجئے جس کے ۱۰۰ صفحے سیاہ سفید کی صورت میں آپ کے سامنے ہیں۔ ان میں ۵۰ صفحے تو اشتہارات کے ہیں ۳۰ تصاویر کے ہیں ۱۰ صفحات فلمی اطلاعات و سوال جواب کے لئے مختص ہیں۔ اگر سرورق اور فہرست کو شامل کر لیجئے تو ان جملہ صفحات کی تعداد ۹۰ ہوتی ہے۔ اس طرح ناظرین کو ۱۰ صفحات پر [illegible] الفاظ ملتے ہیں جنہیں افسانہ، ادبی مضمون، تحقیقاتی مقالہ، غزل یا نظم کہہ سکتے ہیں، اشتہارات میں اوسطاً دو اشتہار ایسے ملیں گے جو جنسی بیماریوں کے مریض کو بقائے شباب کا مژدہ سناتے ہیں ——— اِن اشتہارات کے بلند بانگ دعووں کے بعد تو یہ یقین سا ہونے لگتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد ہندستان واقعی جنّت نشان ہو جائیگا۔ اِس وقت یہ بحث نہیں کہ کیوں یہ جنسی اشتہار بازی ہمارے سماج کا جزو بن گئی ہے۔ لیکن یہ سوال اہم ہے کہ یہ ہمارے ادبی رسائل کا جزو کیوں بن گئی ہے۔؟

عام طور پر ہم اپنے ادب یا رسائل کا دوسرے ممالک کے ادب یا رسائل سے مقابلہ کرتے ہیں اس اعتراض کے جواب میں کہ

جنسی اشتہارات ادبی رسائل کے صفحات پر نہ آنے چاہئیں۔ ایک دوست نے فرمایا کہ یورپ اور امریکہ میں ابھی ایسے اشتہارات نظر آتے ہیں مگر معمولی اور درجہ چہارم کے پرچوں میں ہوتے ہیں۔ یہاں تو چند کو چھوڑ کر باقی تمام اسی کو ذریعہ معاش خیال کرتے ہیں۔ نتیجہ آپ خود اخذ کر سکتے ہیں۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ اشتہارات کے بغیر کوئی ادبی رسالہ نہیں چل سکتا۔ جہاں ذوق مطالعہ یہ گوارا کر سکتا ہو کہ ہم دوسرے کا خریدا ہوا رسالہ یا اخبار پڑھیں وہاں مُدیر غریب کیا کر سکتا ہے۔ لیکن میں یہ تسلیم کرنے کو بھی تیار نہیں کہ بغیر جنسی بیماریوں کے اشتہارات کے کوئی رسالہ چل ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ ۱۰۰ صفحات کے فرضی ماہنامہ کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ ۵۰ صفحہ اشتہارات میں سے صرف ۱۵ ایسے ہیں جو سخت قابل اعتراض ہیں اس لئے اگر ۱۵ میں سے ۱۰ کم کر دیئے جائیں تو آفتاب ادب غروب تو نہ ہو جائیگا۔ آخر بعض ایسے رسائل بھی تو ہیں جو جنسی اشتہارات شائع نہیں کرتے اور گذشتہ دس سال میں آجتک غیر حاضر نہیں ہوئے۔ نہیں نے کبھی ان اداروں کے کسی فرد کو بھیک مانگتے دیکھا۔

میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ادبی ماہناموں میں دس صفحات فلم کے متعلقات اور سوال و جواب کیلئے مختص کرنے سے ادب زبان یا تمدن کے کونسے شعبہ کی خدمت کی جاتی ہے۔ بابو راؤ پٹیل مدیر فلم انڈیا۔ سوال وجواب کے بانی ہیں اور باقی نے انکی نقل کرنیکی بھونڈی کوشش کی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر مُدیر کے پاس پٹیل جیسا حاضر جواب اور شوخ قلم تو ہو نہیں سکتا اسلئے انکی یہ نقالی ہنر تو نہیں البتہ منہ چڑانیکی تعریف میں ضرور آسکتی ہے۔ دلچسپ ہونیکی بجائے یہ سلسلہ مولوی صاحب کا وعظ ہو کر رہ گیا ہے جسکی طوالت اور یکسانیت اپنے اندر کوئی دلکشی نہیں رکھتی۔ بعض رسائل میں تو یہ سوال و جواب خودستائی اور خود نمائی کا ایک مضحکہ خیز نمونہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

سوال۔ آپکا رسالہ بہت خوب ہے۔ سبحان اللہ۔ چندہ کیا ہے۔

جواب۔ شکر اللہ کا۔ چندہ ۱۵۔ آنہ ہے ذریعہ منی آرڈر بھیج دیجئے۔ یا۔

سوال۔ فلاں کم بخت رسالہ آپ سے حسد کیوں کرتا ہے۔

جواب۔ بدبختی اس کی۔ میں تو دل والا ہوں۔ وہ چاہے تو پورا رسالہ مع اسٹاف اور ناظرین کے اس کے حوالہ کر دوں۔

آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں سوال وجواب کا یہ باب کتنے فتنوں کی ابتداء کرتا ہے۔ چنانچہ دوسرے رسالہ کی غیرت کو ٹھیس لگتی ہے اور وہ آئندہ ماہ کچھ اس قسم کے سوال وجواب کر کے دل کی بھڑاس نکال لیتا ہے۔ پھر نمبر ایک اس کا جواب دیتا ہے پھر نمبر دو جواب الجواب عرض کرتے ہیں اور یہ لامتناہی اور نہایت سیریل ناظرین ماہ بماہ باقاعدگی سے دیکھتے ہیں۔

ناظرین کی طرف سے مجھے یہ کہنے کا حق ہے کہ براہ کرم ادبی رسالہ کو ذاتی رنجشوں اور فلم بلیٹن کی نشرگاہ نہ بنایئے۔ فلم کے یہ دس صفحات قطعاً بند ہونے چاہئیں۔ صرف ایک صفحہ کافی ہے جس میں کسی جدید فلم پر کل تبصرہ ہو۔ تصاویر کی ضرورت نہیں انکی اشاعت کو خالص فلمی رسائل کے لئے رہنے دیجئے۔

بہت سے رسائل کا اداریہ، اشاریہ۔ یا مقالہ افتتاحیہ کچھ اُن کی رام کہانی کچھ ہم عصروں پر نکتہ چینی پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ مجہاں نہ صرف ناقص ہے بلکہ نقش اوّل کو ہی بدنما طور پر پیش کرتا ہے۔ اگر ایک ماہنامہ اپنی دانست میں متوسط معیار کا حامل ہو اور ترقی کیلئے کوشاں رہتا ہے تو اسے دوسروں کی فکر کیوں ہو کیا خود اس کی الجھن یا دیگر مسائل کچھ کم ہیں کہ وہ تو تو میں میں کرتا ہے مہذب طریقہ تو یہ ہے کہ معاصرین کی ترقی کو سراہا جاتا ہے انکی دیدہ زیبی یا مضامین کی تعریف کی جاتی ہے انکی کوششوں کا ذکر کیا جاتا ہے اور اگر کسی مضمون پر تنقید مقصود ہو تو تنقید مضمون کی حد تک محدود رکھی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف اداریہ کو خوانیدار کا اکھاڑہ بنانا نہ صرف ادبی بلکہ کاروباری نقطۂ نظر سے بھی ایک اچھا کارنامہ نہیں خیال کیا جا سکتا۔

اریہ میں حالات حاضرہ پر مختصر نوٹ ہونا چاہئے۔ ضروری نہیں کہ مدیر صاحبان ناظرین پر اپنی سیاست دانی کا سکہ ہی جمائیں اس کے لئے ہمارے ہزار ہا لیڈر اور سیاسی اخبار کافی ہیں۔ ادب کے جدید رجحانات کا ذکر کیجئے۔ ادبی انجمنوں کی کارگذاری کا جائزہ لیجئے' انکی رپورٹ کا اختصار درج کیجئے' مفید مشورہ دیجئے۔ بے لاگ اور ذاتیات سے مبرّا تنقید کیجئے۔ اگر کسی جدید لکھنے والے کا تعارف کرانا ہے تو زیادہ سے زیادہ چند الفاظ میں روشناس کرا دیجئے۔ مستقبل خود اس کو اپنی جگہ بتا دیگا میں نے ایک دوست کو لکھا تھا کہ ہمارے ادبی رسائل کو چاہئے کہ وہ مصنفوں کو معاوضہ دینے کی کوشش کریں۔ اسطرح نہ صرف بہتر لکھنے والے ادیب آپکو میسّر آئیں گے بلکہ آپ سے وابستہ بھی ہو جائیں گے۔ اور رسالہ کی اشاعت میں ممّد ثابت ہوں گے۔ معاوضہ دینے کے لئے ایک معیار مقرر کرنا ہوگا اور یہ معیار یقیناً بڑھتا ہی رہیگا اس لئے کہ معیار سے کم درجہ کی چیز آپ اور ناظرین دونوں قبول نہیں کریں گے اور لکھنے والے بھی اس کوشش میں رہیں گے کہ معیار بلند ہو۔ جو مضمون یا افسانہ یا نظم معیار پر اترے اسے شائع کیجئے۔ باقی سے حسنِ اخلاق سے پیش آئیے۔

ان رسائل کے افسانوں مضامین یا منظوم حصّہ کے متعلق میں فی الحال کچھ نہیں کہونگا اس لئے کہ یہ مسئلہ علیحدہ عنوان چاہتا ہے البتہ یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ بیشتر افسانے بے روح ہوتے ہیں ان کا کوئی مقصد کوئی منشاء نہیں ہوتا۔ ترقی پسندی بہت اچھی چیز ہے۔ لیکن عورت کو محض برہنہ پیش کرنے سے کوئی افسانہ نگار ترقی پسند نہیں کہلا سکتا حسن و عشق زندگی کی حقیقت سہی لیکن وقت کا تقاضہ بھی تو کوئی چیز ہے۔ ادب سے قومیں بنتی ہیں ذہنی شعور اور تعلیم کا معیار جیسا کچھ ہے وہ ظاہر ہے۔ یہ رسائل زیادہ تر نوجوان نسل کے ہاتھ میں جاتے ہیں اگر ابتدا ہی سے وہ حسن و عشق کو اپنا منتہا قرار دلیں تو قوم کا انجام معلوم شائع شدہ افسانوں یا نظموں کی حد تک تو مدیر صاحبان یہ کہکر الگ ہو جاتے ہیں کہ اس میں انکا کوئی قصور نہیں۔ جو چیز بلا معاوضہ ان کے پاس آتی ہے وہ اسے پرکھ کر شائع کر دیتے ہیں۔ لیکن رسالہ کی پیشکش ترتیب اور تالیف کے لئے تو وہ بالکلیہ ذمہ دار ہیں اور کسی طرح بھی ان الزامات سے بری نہیں ہو سکتے جو میں نے ناظرین کی عدالت میں پیش کئے ہیں۔ مزید جرح سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ وہی فرسودہ جواب ملیگا کہ "ہم کیا کریں" تاہم اتنا عرض کئے بغیر نہ رہونگا کہ ادب کی نئی قدروں کو پہچانئے ادب کو قوم اور سماج کی اصلاح اور ترقی کا ذریعہ بنائیے جو پستی اور ابتری موجود ہے اس کو دور کرنے میں جدید نسلوں کو آپ کی امداد کی سخت ضرورت ہے۔ آج ہم ایک ایسے دوراہے پر کھڑے ہیں کہ اگر غلط راستہ پر چلے گئے تو منزل تک پہونچنے میں دوسروں سے بہت پیچھے رہ جائیں گے۔

ادیبوں سے میری گذارش ہے کہ لکیر کے فقیر نہ بنئے اپنے لئے علیحدہ دنیا تلاش کیجئے' نئی راہیں پیدا کیجئے۔ جرأت اور ہمت کی ضرورت ہے یہ مانا کہ عورت افسانہ اور زندگی کی جان ہے اور بادہ و ساغر کہے بغیر بنتی نہیں لیکن بادہ ایسا ہونا چاہئے کہ سُرور پیدا کرے مدہوش نہ کرے اور نماز ساقی کو رندانہ نہیں حکیمانہ ہونا چاہئے۔

کیا ناظرین اپنے متعلق بھی کچھ دیکھنا گوارہ فرمائیں گے؟۔ کیا حرج ہے؟ اگر اس آئینہ میں ہم اپنی صورت بھی دیکھتے چلیں۔ ہندکی ۴۰ کروڑ آبادی کا نصف حصّہ یعنی ۲۰ کروڑ اردو بولتا ہے اور جملہ آبادی کے ۱۰ فیصد حصّہ تعلیم یافتہ ہونیکے تناسب سے کم از کم ۲۰ لاکھ آدمی اردو پڑھتے ہیں (پڑھنے سے میری مراد معمولی نوشت و خواند ہے) اگر اس ۲۰ لاکھ کا ایک فیصد اردو ادب کا مطالعہ کرتا ہے تو بیس ہزار آدمی ایسے ملیتے ہیں جو اردو کا باقاعدہ مطالعہ کرتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ کوئی کتاب ۵۰۰ سے زیادہ طبع نہیں ہوتی کوئی اردو کا اچھا رسالہ ۱۰۰۰ سے زیادہ نہیں چھپتا (اعداد و شمار موجود نہیں اس لئے یہ تعداد بھی مبالغہ معلوم ہوتی ہے)؛ کیا ادب کی یہ کم قدری علم کی یہ نارسائی مدیر صاحب یا مصنفین کے فرد جرم میں ہی لکھی جائیگی؟ آپ کا کوئی دوش نہیں آپ بالکل بری ہیں۔ آپ رسالہ مانگ کر نہیں پڑھتے۔ کتاب کے لئے دوستوں کے گھر کے مسلسل چکر نہیں لگاتے۔ آخر آپ کا شوق مطالعہ

(باقی صفحہ ۵۴ پر)

ہشتر رؤفی

اَدَب اور سیاسیات

ابتدائے آفرینش سے لیکر اب تک تمام دنیا کی تاریخ کا مطالعہ کرنے اور ہر زمانے کے قتل و غارتگری، خونریزی و بربادی کے واقعات کو نظرانداز کرنے کے بعد ایک چیز ذہن میں واضح طور پر باقی رہ جاتی ہے۔ جس کو اس طرح ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ اسی کی روشنی میں ہمیں زندگی کے معنی بھی معلوم ہوسکتے ہیں۔ لامعلوم تعمیر۔ اس کی تکمیل۔ مابعد انحطاط اور تخریب۔ اس طرح تعمیر و تخریب کا وہ سلسلہ نظر آتا ہے جو قرنوں سے جاری ہے اب بھی ہو رہا ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ کب تک جاری رہیگا اس وقت تک جاری رہنے کا امکان ہے جب تک کہ زندگی میں حرارت کی آخری رمق بھی باقی ہے۔ اب گویا زندگی کی تعریف، تعمیر کی کامیاب جدوجہد کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اور اس وقت حال یہ ہے کہ ؏

"تخریب نے پرچم کھولا ہے سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں"

اسی قسم کے حالات میں ہمارے موجودہ ادب نے آنکھ کھولی۔ اس کی پیدائش کا زمانہ وہی ہے۔ جب تعمیر میں مسلسل رکاوٹ اور ٹھیراؤ کی وجہ سے گھن لگ چکا تھا۔ اور تخریبی قوتیں غالب آچکی تھیں جب ہمارے باشعور ادیبوں نے آنکھ کھولی اور گرد و پیش کا جائزہ لیا تو یہی تخریبی عناصر چاروں طرف جاری و ساری تھے۔ اسی وجہ سے جدید اور ترقی پسند ادب میں اس عنصر کی ترجمانی ایک حد تک زیادہ ہے۔ لیکن اس کی موجودہ روش سے صحت مند انقلاب کی امید کی جاسکتی ہے کہ زمانے کے حالات کے ساتھ ساتھ بہت امید افزا اور خوشگوار تبدیلی ہوتی جائیگی۔

زندگی کا یہی اصول ادب میں بھی کارفرما ہا۔ اور گہری نظر رکھنے والوں سے پوشیدہ نہیں کہ موجودہ حالات میں ترقی پسند ادب کا پیدا ہو جانا زمانے اور فطری مطالبات کا تقاضہ تھا جو پورا ہو کر رہا۔ زندگی نے چولا بدلا اور ادب نے اس کی ترجمانی کی زندگی نے مختلف شعبہ جات حیات میں ناتہ جوڑا اور ادب نے اس کو بیان کیا ـــــ زندگی نے کروٹ لی اور ادب نے اٹھ کر سہارا دیا ـــ زندگی نے کرب سے آہ بھری اور ادب نے اس آہ میں تاثیر کا رنگ بھر کر دوسروں کو بھی تڑپا دیا۔ یہی چیز ہے جو اس وقت ادب اور سیاسیات جیسے، بظاہر متضاد لیکن بباطن مربوط، عنوانات پر سوچنے پر آمادہ کر رہی ہے۔ آیئے ادب اور سیاست کی علمی مفاہیم کو پیش نظر رکھکر دونوں کو واضح طور پر سمجھنے کی کوشش کریں۔ ممکن ہے کہ یہ طریقہ ہمارے لئے خیال کی نئی راہیں متعین کرے اور ہم دونوں کے باہمی تعلق کو بخوبی سمجھ سکیں

زندگی کھانے پینے اور چند ذاتی مطالبات کے پورا کرنے ہی سے عبارت نہیں بلکہ اس کا خاص مادی اور جماعتی پس منظر بھی ہے اور دنیاوی زندگی کی ترقی اسی پس منظر کو اجاگر کرنے کا دوسرا نام ہے۔ آپ ہم میں سے ہر شخص اپنی انفرادیت کو چھوڑکر ایک اجتماعی درجہ بھی رکھتا ہے۔ گویا ہمارے فرائض دوہرے ہو جاتے ہیں۔ جب ہم ان فرائض کی انجام دہی کیلئے اور ان کے فوائد سے تمتع کیلئے اکٹھے ہوتے ہیں تو یہی جماعت کبھی خاندان کبھی برادری، اور اس سے آگے بڑھکر نسل اور قوم میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات یہی جماعت ہمارے مخصوص نظریات اور فوائد کے پیش نظر شاعروں کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں کبھی انجمن ترقی پسند مصنفین کا عام جلسہ کرتے ہیں۔ سیاست ہمارے اسی شعبہ زندگی کی ترجمانی کرتی ہے اس کی فلاح و بہبود میں کوشاں رہتی ہے، اس کی تمام غرض و غایت یہی ہے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے باہمی توازن کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنائے

اور ایک ایسے نظام کے قیام کی کوشش کرے جس میں فرد کو اجتماعی اصول و قواعد کی بنا پر پوری پوری آزادی ہو۔ اس نظام میں زندگی کی قوتوں کو سرسبز ہو کر نشو و نما پانے کا موقع مل سکے۔ ابھی تک جتنے بھی نظام دنیا پر راج کر چکے ہیں ان میں کسی نہ کسی حیثیت کو یہ نقائص موجود تھے ورنہ موجودہ نظام زندگی کو نئی اور ٹھوس بنیادوں پر تعمیر کرنے کے لئے انسان کو اپنی معروف زندگی میں سیاست کا اضافہ کرنے کی نوبت نہ آتی۔

ادب کا زندگی سے براہ راست تعلق ہے اور سیاست ہماری نصف زندگی لہٰذا ادب اور سیاست کا مربوط ہونا لازمی امر ہے۔ لیکن اگر ہم ادب میں سیاست کے اصول و فروغ، اس کے قوانین، اس کی تجاویز اور کارناموں کو تلاش کریں تو یہ نہ صرف سعی لاحاصل ہوگی بلکہ نفسِ مضمون سے بے خبری کی بھی چغلی کھائیگی۔ اب ہمارے لئے ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ ہم سیاست کی دھڑکنوں کو ادب کی نبضوں میں محسوس کریں ان ادبی کارناموں پر غور کریں جو ہماری ملی اور قومی زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ فنکاروں کی ان تخلیقوں پر غور و خوض کریں جو ہمارے تمدن اور ہماری تہذیب پر براہ راست اثر انداز ہیں۔ یا ان کو محاسن و معائب کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ آرٹ کے ان لطیف کنایوں کو سمجھنے کی کوشش کریں جن میں فنکاروں نے اپنی روح کی گہرائیاں سمو کر زندگی کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ مسلمہ ہے کہ آرٹ کا سب سے بڑا خزانہ اور اسکا بہترین نمائندہ ادب ہے جس میں وقت کی ہر رفتار پر نظر رکھی جا سکتی ہے، زمانے کے ہر قدم کو پرکھا جا سکتا ہے ہر ملک و قوم کے تمام رجحانات اور میلانات کو سمجھا جا سکتا ہے

جب ایک نظام حکومت بوسیدہ ہو کر ناقابل عمل ہو جاتا ہے تو انسانی سوسائٹی اس کو پرانے لباس کیطرح اتار پھینکتی ہے اور دوسرا اس کی جگہ لینے کے لئے آگے بڑھتا ہے۔ گذشتہ دو تین صدیوں میں یورپ نے جس قدر نظام حکومت اور نظام معاشرت پیش کئے اس کی مثال تاریخ میں ناممکن ہے۔ ہر نظام کے متعلق اردو ادب میں تفصیلی مواد فراہم کرنے کی یہاں گنجائش نہیں فاشزم کے متعلق اختر انصاری کے جذبات ہیں:۔

کچھ ستم اور دیو استبداد ÷ اک قدم اور دیو استبداد
ہیں ابھی ایسی بستیاں باقی ÷ ابھی بھی ہیں چند سخت جاں باقی
کچھ ستم اور . . . .
تیری منزل ہے اب قریب بہت ÷ رہی دنیا ستم نصیب بہت
یا مخدوم کہتے ہیں:۔

نکلے دہانِ توپ سے بربادیوں کے راگ
باغ جہاں میں پھیل گئی دوزخوں کی آگ،

آمریت اور کمیونزم کے بعد جمہوریت دنیا کے لئے خوب آدرش سے بھی زیادہ سحر طاری کرنے والی ثابت ہوئی۔ لیکن مفکر کی نظر ہمیشہ تہ کے موتی پرکھتی ہے۔ چنانچہ اقبال نے جس شرح و تفصیل سے اُن باریک نکات کو بیان کیا ہے جن کو عقل سمجھنے میں دیر لگاتی ہے

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام ÷ جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب ÷ تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق ÷ طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیٔ گفتار اعضائے مجالس الاماں ÷ یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری

جمہوریت کے ساتھ دنیا میں مشینی دور کی آمد سے تجارتی منڈیوں میں بھاگ دوڑ مچ گئی اور ہر شخص حتی الامکان پھلنے کی فکر کرنے لگا

ابھی سرمایہ کی لوٹ کھسوٹ میں روپیہ پیسہ عوام کے ہاتھوں سے کھینچ کر چند مٹھیوں اور تجوریوں میں جا پہنچا حقیقی نظروں سے دیکھا جائے تو سرمایہ داری بھی ایک ایسا نظام حکومت ہے، جس میں ایک طبقہ عوام کو نشہ پلا کر لوٹ مار کرتا ہے یہ کسی نظام حکومت یا نظام معاشرت کی بدترین بگڑی ہوئی شکل ہوتی ہے۔ مخدوم کہتے ہیں:-

زرگری کا رقص ہے سود و زیاں کا رقص ہے ∴ ہر گلی کوچے میں مرگِ ناگہاں کا رقص ہے
ہاں وہیں میرے دلِ زار نے یہ بھی دیکھا ∴ ہاں میری چشم گنہگار نے یہ بھی دیکھا
خونِ دہقاں میں ہے عمارت کے سفینے غلطاں ∴ ہر طرف عدل کی جلتی ہوئی میت کا دھواں

اقبال نے کہا ہے:-

میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب ∴ میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں
میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا ∴ میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

اور ان تمام افعال کا فاعل ابلیس ہے جو سرمایہ داری کو اپنا سب سے بڑا کارنامہ خیال کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں اگر کمیونزم کے بڑھتے ہوئے رجحانات اور ہمہ گیر مقبولیت کا ذکر نہ کیا جائے تو ہمارے ادب کا ایک بڑا پہلو غور کرنے سے رہ جائیگا سرمایہ اور زر و مال کی غیر مساوی تقسیم نے ہمارے ملک کے باخبر اور باشعور طبقوں کو بری طرح متاثر کیا اور اس کی بازگشت ادب میں نمایاں طور پر سنی جا سکتی ہے۔ مزدور اور اس کی قابل رحم زندگی۔ اس کی پستیاں اور اس کی مظلوم داستانِ حیات ایک طرف ادیبوں کی حمایت حاصل کئے ہوئے ہے تو دوسری طرف سرمایہ دار کے انسانیت سوز مظالم کے خلاف بغاوت اس کی مذمت اور اس پر لعنت ہمارے ادب کے سیاسی پہلو کے خاص موضوع ہیں۔ جن پر ادیب مکمل خلوص اور زندگی کی سچائیوں کا سہارا لیکر آرٹ کی تکمیل کر رہے ہیں۔ سرمایہ داری کے خلاف مزدور متحد ہوئے اور اپنے گاڑھے خون کی کمائی میں سے حصہ بٹانا چاہا۔ سرمایہ دار اس پر راضی نہ ہوا اور اس طرح دونوں قوتوں میں کشمکش اور کھچاؤ پیدا ہو گیا۔ اسی کشمکش کو بنیادی طور پر حل کرنے کیلئے روس میں چند لوگ سر جوڑ کر بیٹھے اور کمیونزم کی بنیاد ڈالی۔ ہمارا ملک اس سے خاص طور پر متاثر ہے۔ اقبال کا پیغام ہے مزدوروں کے نام:-

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر ∴ شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو یوں مزد ملتی رہی ∴ اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ ∴ خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار ∴ انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے ∴ مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

حسرت کہتے ہیں:-

یا رب یہ جہانِ گذراں خوب ہے لیکن ∴ کیوں خوار ہیں مردانِ صفا کیش و ہنرمند
گو اس کی خدائی میں مہاجن کا بھی ہے ہاتھ ∴ دنیا تو سمجھتی ہے فرنگی کو خداوند ۔۔۔

ملک کی سیاست کی باگ دوڑ ہمارے لیڈروں کے ہاتھوں میں ہے اور ہر لیڈر اپنی جگہ اس قدر دیانت دار نہیں کہ اس امانت کا بوجھ سنبھال سکے جو قوم نے اس کو سونپی ہے جب یہ لوگ خود فروشی اور تن آسانی سے گذر کر قوم فروشی پر اتر آتے ہیں تو ادیب اس طرح باز پرس کرتا ہے۔

سالہا سال سے یہ بے آسرا جکڑے ہوئے ہاتھ ∴ رات کے سخت و سیہ سینے میں پیوستہ ہے

تیرا سرمایہ، تری آس یہی ہاتھ تو ہیں ٭ اور کچھ بھی ہے ترے پاس؟ یہی ہاتھ تو ہیں
تجھکو منظور نہیں غلبۂ ظلمت لیکن ٭ تجھکو منظور ہے یہ ہاتھ قلم ہو جائیں
اور مشرق کی کمیں گہ میں دھڑکتا ہوا دن ٭ رات کی آہنی میت کے تلے دب جائے " فیض

غلامی کی لعنتوں سے تنگ آکر ادیب اپنے ماحول سے باغی ہو جاتا ہے اور بانگ دہل چلاتا ہے یہی چیخ و پکار سیاسی جدوجہد کی آئینہ دار ہے جو اچھی طرح واضح کر دیتی ہے کہ عوام اس روش سے غیر مطمئن ہیں۔ یہی ملک و قوم کی بیداری کی ضامن ہے جو ذہن کو آرٹ کے ذریعہ متاثر کرتی ہے اور سیاست و ادب کی بنیادوں کو غیر فانی بنا کر مربوط کر دیتی ہے۔

ذہن ہے مائل پیکار ٭ قلم ہے معذور
دل ہے آمادۂ گفتار ٭ زباں ہے محصور
بہے بہے سے ہیں افکار ٭ کہ جیسے دور...... دور
وہ ہوی خواب سے بیدار کساں اور مزدور
اب نہیں شب کی سپہ کار
حکومت منظور

نہ یہ بے روح تمدن نہ حقائق پہ قیود ٭ نہ یہ جاں سوز سیاہی نہ غلامی کی نمود (ظہور نظر)

عوامی رجحانات اور حقیقت کے مشاہدے کی ایک اور عمدہ مثال ہے

رات دن ٭ ایک افسانہ بنے جلتے ہیں ٭ مختلف باب مگر ایک پلاٹ ٭ کبھی یونان کے غلاموں کی بغاوت کا سماں
کبھی پیرس کا کمیون ٭ کبھی روسی مزدور ٭ زار کا تخت الٹنے کیلئے تیغ بکف ٭ مختلف باب مگر ایک پلاٹ
وہی طبقات کی جنگ ٭ ظالم و مظلوم کی جنگ ٭ جسکی بنیاد پہ ہے قائم نظام عالم ٭ (غلام ربانی تاباں)

ان تمام حالات کے باوجود مستقبل کی تابندگی رواں دواں ہمیں لئے جارہی ہے اور اسی کے سہارے ہماری بے نام و نمود زندگی میں کبھی کبھی روشنی کی جھلک نظر آتی ہے۔ "سویرا"

پھر سیہ نغمۂ شب گیر کی افسردہ فغاں ٭ دور لہراتی ہوئی جاتی ہے۔
نیلگوں سرخ سنہری تانیں ٭ وقت کے ساز کے پردے کی لپک اٹھتی ہیں
سیم بر کہر کی موجوں میں ڈھیمی دیویں ٭ سروشنات ہواؤں میں اٹھیں
سانس لیتے ہوئے سینہ تلنے
اس خرابات کے بام و در و دیوار کو اب ٭ کر دیا جائیگا اک کہنہ کھنڈر کی صورت
تاکہ اک اور ہی دنیا کو بسایا جائے ٭ ایسے انساں کیلئے جسکی ہو باغی فطرت
یہ شفق زار، یہ تارے، یہ حسیں دنیائیں ٭ آج ہے حضرت یزداں کا تسلط جن پر
کل کیا جائیگا انساں کے حوالے ان کو
(عزیز اختر وارثی)

(بقیہ صفحہ ۵۰) اتنا سستا کیوں ہے۔ کیوں آپ کتاب یا رسالہ خرید کر نہیں پڑھتے کہ ان کی اشاعت بڑھے، اور وہ اچھے سے اچھے مضامین آپ کے لئے شائع کر سکیں۔ جب آپ رسالہ خریدینگے کتاب کی قیمت دینگے تو آپ کو احساس ہوگا کہ آپ نے کیسا مال خریدا، اس وقت آپ اصرار کر سکیں گے، دلچسپی لیں گے اور بازاری ادب کے ان سرمایہ داروں سے کہہ سکیں گے کہ یہ مال ناقص ہے، ہمیں نہیں چاہئے، اس سے بہتر چیز دو، ہم قیمت ادا کرنیکو تیار ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۲۶) "ہاں! تو جانتی ہے، سکون آباد کی گلیوں اور کوچوں میں وحشت اور بربریت کی آگ لگانے والا یہی شیطان گورا ہے اس میں آریو اور عربو کا کوئی قصور نہیں۔ ماں تو جانتی ہے؟ گورا نہایت کمینہ، پرلے درجہ کا مکار، حد درجہ فریبی اور سو لہ آنہ وعدہ فراموش ہے، اس کی رگ رگ میں دہریت رچی ہوئی ہے لیکن حکومت کے معاملہ میں وہ مذہب کی آڑ لیتا ہے اور اس مذہب میں مکاری کا رنگ دیکھ اپنا الو سیدھا کرتا ہے۔ آج کے سکون آباد کا "شیطانی ہنگامہ" گورا کی اسی "پالیسی" کا "بدترین کارنامہ" ہے۔ جسے زمانہ کبھی اپنے ذہن سے بھلا نہیں سکتا۔

"عربو اور آریو اپنے کئے پر پچھتا رہے ہیں۔ انھوں نے اب سمجھا ہے کہ بندے ماترم جی جی کالی کا لی اور اللہ اکبر کا فلک شگاف نعرہ لگا کر اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے، عربو کی ماں پر چھری نہیں پھیری ہے بلکہ اپنی ماں کو ذبح کیا ہے آریو کے باپ کو قتل نہیں کیا ہے بلکہ اپنے بابا کا خون بہایا ہے ...... "

"ماں!"

"ماں!!"

دونوں آوازیں تھوڑے فاصلہ سے سنائی پڑیں۔ دونوں میں وہی ندامت، وہی شرمندگی، وہی پیار اور وہی محبت چشمے کے شفاف پانی کی طرح منظر تھی۔

"سن رہی ہو۔ ماں سن رہی ہو۔ دونوں نزدیک آگئے ہیں۔ دونوں بے طرح ہراساں اور مضطرب معلوم ہو رہے ہیں کیونکہ ان کی آوازیں اس کی شہادت دے رہی ہیں .... مگر تم ہو کہ اب بھی اپنی ضد پر قائم ہو، اور ....؟"

"نہیں نہیں شدرو، میں نہیں جاؤں گی" ماں کی آنکھوں میں شبنم نما ہزاروں قطرے تیرنے لگے "کہاں ہے عربو اور آریو۔ انھیں آواز دو۔ ہاں ہاں میں بھی ان کی پکار سن رہی ہوں، شدرو، میرے بیٹے! ...... اب میں اپنا "ارادہ" رب الکریم کے زندہ جاوید نام پر چھوڑتی ہوں اور ایک بار پھر ٹیپو جیسے بہادر کی ماں اور بھگت سنگھ جیسے جاں نثار کی ماتا بنکر آریو اور عربو کے "خونی دلوں" میں اخوت، مساوات، اور حریت کا جذبہ پیدا کروں گی اور از سر نو پھر زندگی کا ایک نیا باب پڑھاؤں گی ......
..............؟

"ماں! ماں!!" شدرو خوشی کے مارے اس کے دونوں پاؤں جھنجھوڑنے لگا "یہ تم کہہ رہی ہو، تم کہہ رہی ہو ......
......" اور فرط مسرت و محبت میں ماں کے پاؤں بار بار چومنے لگا!!۔

نمائندہ افکار مقیم بمبئی کے قلم سے!

فلمستان

انڈین موشن پکچرز کے اعزازات

انڈین موشن پکچرز کی اکیڈیمی کی مجلس مشاورت نے ۱۹۴۶ء کے لئے حسب ذیل فلمی اعزازات کا اعلان کیا ہے:-

سال کا بہترین فلم - دھرتی کے لال — (پیپلز تھیٹرس)
" سوشل فلم - انمول گھڑی — (محبوب پروڈکشن)
" مسلم سوشل فلم - پہلی نظر — (منظر آرٹ پروڈکشن)
" ہندو میتھالوجیکل فلم - بھگت پرہلاد — (وشنو سینیٹون)

سال کا بہترین اداکار — شاہنواز

سال کی بہترین اداکارہ — لیلا مصرا

سال کی بہترین عکاسی - ڈاکٹر کوٹنس کی امر کہانی (راج کمل کلا مندر)

بہترین مناظر — دل (فضلی برادرس)

بہترین افسانوی تصویر — آٹھ دن (فلمستان لمیٹڈ)

بہترین تاریخی فلم — بیرم خان (اسٹینڈرڈ فلمز لمیٹڈ)

بہترین ہدایت کار — اے، آر، کاردار

بہترین میوزک ڈائرکٹر — نوشاد علی

بہترین مغنّی — (آنجہانی) کے، ایل، سہگل

بہترین مغنیہ — نورجہاں

فلموں میں شرابی مناظر

حکومت بمبئی نے اعلان کیا ہے کہ فلموں میں شراب نوشی کے مناظر قطعی نہ دکھائے جائیں اور امتناع مسکرات کی پالیسی کے تحت ایسے مناظر کی فلم بندی پر سخت ترین پابندیاں عائد کردی ہیں۔

فلمساز کی اقتصادی زبوں حالی

بمبئی کے فلمساز آجکل فنانس سے بالکل محروم ہو گئے ہیں۔ نہ تو بمبئی کے سیٹھ انہیں روپیہ دے رہے ہیں اور نہ شمالی ہند کے سرمایہ دار اپنا سرمایہ لگانے کے لئے تیار ہیں۔ بمبئی کی فلمی صنعت تقریباً فنا ہو چکی ہے۔ اب صرف وہی فلم کمپنیاں زندہ رہ سکتی ہیں جنکے پاس ذاتی سرمایہ ہے۔

اداکاروں کی قیمت

موجودہ حالات نے اداکاروں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ بمبئی کی فلمی صنعت کے تعطل نے اداکاروں کی قدر و قیمت صفر کے برابر کردی ہے۔ جو اداکار کسی زمانہ میں ایک لاکھ سے کم میں سودا کرنے کو تیار نہ تھے وہ اب دس بیس ہزار میں بھی کام کرنے کو تیار ہیں اور بعض اداکاروں نے تو اداکار بننے کی بجائے بیوپار شروع کردیا ہے۔

لکھنؤ میں ایک نیا فلمی ادارہ

معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ سرزمین "لکھنؤ میں" "اودھ فلم کارپوریشن لمیٹڈ" کے نام سے ایک نئے فلمی ادارہ کا قیام ہوا ہے۔ یہ کمپنی پانچ لاکھ روپیہ کے سرمایہ سے معرض وجود میں آئی ہے جسے چند ایسے کامیابی کے ضامن حضرات کا تعاون حاصل ہے جو نہایت بیدار مغز، تجربہ کار اور ماہر صنعت ہیں۔ اس ضمن میں کمپنی کے منیجنگ ڈائرکٹر- ڈاکٹر حسین قیصری جنہیں صنعت فلمسازی کے ہر شعبہ میں کافی تجربہ ہے اور مشہور ترقی پسند مصنف و ادیب اخلاق حسین عارف جن کو کمپنی کو بہ حیثیت ڈائرکٹر علمی، عملی اور اقتصادی اشتراک حاصل ہے قابل ذکر ہیں۔ سنا گیا ہے کہ کمپنی جلد ہی اپنے کل حصص فروخت کرنے کے بعد اپنی پہلی معاشرتی تصویر کا اعلان کردیگی۔ ہم اس ادارہ کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ صنعتی طور پر کارکنان کمپنی لکھنؤ کے عہد رفتہ کے جمود میں "افکار نو" سے ایک "جہان تازہ" کی تخلیق کریں گے۔

افضل ہالی ووڈ کو

سنا گیا ہے کہ شانتی ہالی ووڈ میں انگریزی زبان میں فلمایا جائیگا جس میں افضل، جو بھوپال کا حسین ترین اور دنیائے فلم کا مشہور نوعمر اداکار ہے کام کرے گا۔ افضل کے ساتھ وجے لکشمی اور جیون کا نام بھی لیا جا رہا ہے۔